اس راہ میں کئی عرش کئی فرش پڑیں گے !
حالانکہ یہ منزل ہے رگِ جاں سے بھی نزدیک

اُمُّ الکتاب میں اللہ کا تعارُف

جس کے پڑھنے کے بعد
شرک اور دہریت کی دیواریں ریزہ ریزہ ہوجاتی ہیں !

علامہ ابوالخیر اسدی

مجلس نشر السنّۃ - مخدوم رشید (ملتان)

قیمت ۱۲۰/- روپے

ادارۂ اسلامیہ
مخدوم رشید۔ ملتان
0301-7444110
Azhar.asdi@gmail.com Idarahislamia.com

فہرست مضامین

کتابت : محمد اقبال یوسفی ملتان
رجب المرجب ۱۴۱۶ھ / ۹۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

تمام رسولوں کی تعلیمات کا خلاصہ تین چیزیں ہیں ___

۱ ___ معرفتِ الٰہیہ ___ یہ وہ اصل مقصد ہے جس کے حاصل کرنے کے لئے انسان کی تخلیق کی گئی ہے ___

۲ ___ رسالت ___ یہ معرفتِ الٰہیہ کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت رسولوں کی تعلیم کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی ___

۳ ___ آخرت ___ یہ ہر عمل کے انجام کا دن ہے تاکہ اُس دن معلوم ہو سکے کہ معرفت کے حصول میں کون سے انسان کامیاب ہوئے اور وہ کون انسان ہیں جنہوں نے رسولؐ کی تعلیم کے بعد اس معرفتِ الٰہیہ کا صریحاً انکار کر دیا تھا تاکہ ان دونوں فریقوں کو اپنے اپنے عمل کا پورا صلہ دیا جا سکے ___

ان تینوں چیزوں کو

سورۃ فاتحہ میں اجمال کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ باقی سارے قرآن میں ان تینوں اصولوں کی تفصیل کے ساتھ تشریح کی گئی ہے ___

۱ ___ الحمد للہ رب العالمین میں معرفتِ الٰہیہ کا بیان ہے ___

۲ ___ انعمت علیہم میں اُن منعم علیہم رسولوں کا ذکر ہے جن کے ذریعے انسانوں کو معرفتِ الٰہی

کی تعلیم دی گئی ہے اور ان میں اُن لوگوں کا بھی ذکر ہے جن پر اطاعت کی وجہ سے انعام ہوتا رہا ہے ——

۳ —— مالکِ یومِ الدین میں آخرت کا اثبات ہے جس میں معرفتِ الٰہیہ میں کامیاب انسانوں اور ناکام سرکشوں کے انجام کا امتیاز کیا جائے گا ——

چونکہ یہ تینوں باتیں **ایمانیات** کا جزوِ اعظم ہیں جب تک ان پر پورے یقین کے ساتھ ایمان نہ لایا جائے کوئی انسان بھی حقیقی مسلمان نہیں ہو سکتا اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ **اُمّ الکتاب** کی تفسیر میں معرفتِ الٰہیہ کی تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے —— تاکہ : ——

ملحدین، مشرکین اور متشککین

کی طرف سے اب تک اللہ کی معرفت اور اس کے وجود پر جتنے شبہات وارد کیے گئے ہیں ان کے ہر ارتیابی نظریئے کی اچھی طرح **تردید** ہو جائے ——

اللہ سے دُعا ہے کہ ہماری اس ادنیٰ کاوش کو معرفتِ الٰہیہ کے بھٹکے ہوئے انسانوں کے لئے صحیح ہدایت کا ذریعہ بنا دے —— آمین ! ——

۵ —— یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے
ظلمتیں سب دُور ہوں گی جلوۂ خورشید سے

عاجز **ابوالخیر اسدی**

۷ / دسمبر ۱۹۹۵ء

مُقدّمۃ الکِتاب

قرآن میں دو مقام پر (البقرہ ۱۹۳، الانفال ۳۹) یہ حکم دیا گیا ہے کہ :۔

وقاتلوهم حتّٰى لا تكون فتنة ويكون الدين لله :۔۔۔۔

" اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کیلئے ہو جائے "۔

جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر کی تشریح سے معلوم ہوتا ہے ، اس آیت میں فتنہ سے مُراد شرک جارح ہے ، انہوں نے فرمایا کہ اُس وقت اسلام تھوڑا تھا ، چنانچہ جب کوئی شخص دینِ توحید کو اختیار کرتا تو اہلِ شرک اُسے ستاتے ، کسی کو وہ قتل کر دیتے ، کسی کو زنجیروں میں باندھتے اور کسی کو عذاب دیتے ، یہاں تک کہ اسلام کی کثرت ہو گئی اور یہ صورتِ حال باقی نہ رہی کہ عقیدۂ توحید کی بنا ء پر کسی کو ستایا جائے ۔۔۔۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

اس سے معلوم ہُوا کہ یہاں فتنہ سے وہی چیز مُراد ہے جس کو ایذارسانی کہا جاتا ہے یعنی مختلف عقیدہ رکھنے کی بناء پر کسی کو ستانا قدیم زمانہ میں شرک کو غلبہ حاصل تھا۔ چنانچہ اہلِ شرک ہزاروں سال تک یہ کرتے رہے کہ وہ توحید کا عقیدہ رکھنے والوں کو ستاتے ۔

(وما نقموا منهم الا ان يؤمنوا بالله العزيز الحميد) ۔۔۔۔

پیغمبر آخر الزماں (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کا مشن یہ تھا جس کو آپ نے اپنی زندگی میں مکمّل

فرمایا کہ آپؐ اس مخالفانہ صورتِ حال کو ختم کر دیں کہ وہ شرک کے عومی غلبہ کو ہمیشہ کے لئے مٹا دیں تاکہ خدا کے بندوں کے لئے توحید کا عقیدہ اختیار کرنے میں جو چیز رکاوٹ بن رہی ہے وہ رکاوٹ باقی نہ رہے ——

موجودہ زمانہ میں شرک کی جارحانہ حیثیت ختم ہو چکی ہے مگر غور کیجئے تو اصل صورتِ حال، دوبارہ ایک نئی شکل میں لوٹ آئی ہے۔ آج دوبارہ انسان کے لئے دینِ توحید اختیار کرنے کی راہیں رکاوٹیں پیدا ہو گئی ہیں —— مگر آج دین سے روکنے والا عنصر اپنا کام فکری طاقت کے زور پر کر رہا ہے نہ کہ شمشیری طاقت کے زور پر ——

آج کا فتنہ جدید ملحدانہ افکار کا فتنہ ہے۔ جو کام قدیم زمانے میں شرک کرتا تھا وہ آج ملحدانہ افکار انجام دے رہے ہیں۔ آج کی دُنیا میں ایسے افکار غالب آگئے ہیں جو خدا کے وجود کو مشتبہ قرار دیتے ہیں جو وحی و الہام کو فرضی بتاتے ہیں، جو آخرت کو بے بُنیاد ثابت کر رہے ہیں۔ اس طرح یہ افکار دینِ توحید کو اختیار کرنے میں مانع بنے ہوئے ہیں۔ آج کا فتنہ یہ ہے کہ خود سوچنے کے انداز کو بُنیادی طور پر بدل دیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کا انسان یا تو منکر بن گیا ہے یا وہ کم از کم متشکک ہے ——

یہ ایک قسم کا فکری حملہ ہے۔ ہم کو اس حملہ کا مقابلہ کرنا ہے۔ اب ہمیں دوبارہ قاتلوھم حتّٰی لا تکون فتنۃ پر عمل کرنا ہے۔ مگر یہ عمل شمشیر کے ذریعہ نہیں ہوگا بلکہ افکار کی طاقت کے ذریعہ ہوگا، ملحدانہ افکار کا جواب ہمیں توحید افکار سے دینا ہے۔ آج ضرورت ہے کہ اعلیٰ علمی استدلال سے جدید ملحدانہ افکار کو بے بُنیاد ثابت کر دیا جائے۔ ہماری یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک یہ نظریات اپنا غلبہ نہ کھو دیں۔ اور توحید کا فکر وقت کا غالب فکر بن جائے ——

غلبہ اور مغلوبیت کا یہ واقعہ اولاً فکری میدان میں ہوگا۔ یہ اسی قسم کا ایک واقعہ ہوگا جیسا کہ ہم موجودہ زمانہ میں مغربی افکار کا دیکھ رہے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں سائنسی علوم

نے روایتی علوم پر غلبہ پایا ہے، شہنشاہی نظریہ کے اوپر جمہوری نظریہ فائق ثابت ہوا ہے تخلیقی طرزِ فکر پر ارتقائی طرزِ فکر کو بالاتری حاصل ہے۔ یہ سب کے سب فکری غلبہ کے واقعات ہیں۔ اسی نوعیت کا غلبہ ملحدانہ فکر پر موحدانہ فکر کے لئے مطلوب ہے، یہی غلبہ ملّت کی اگلی تمام کامیابیوں کی تمہید ہے ——

اس سلسلہ میں ایک اور اہم بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ موجودہ زمانہ میں ملحدانہ افکار کا غلبہ ان کی کسی جوہری اہمیّت کی وجہ سے نہیں ہوا ہے۔ یہ تمام تر صرف مغالطہ کے ذریعہ حاصل کیا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں جو نئے سائنسی حقائق دریافت ہوئے وہ حقیقۃً "قدرتِ خداوندی کے بھیدوں کا اظہار تھے، اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ دینِ توحید کے حق میں فطرت کے دلیل تھے، مگر مسلمان مختلف اسباب میں جدید سائنسی علوم میں پیچھے ہوگئے۔ وہ اس قابل نہ ہوسکے کہ ان علوم کو صحیح رُخ دے سکیں۔ اور ان کو دین کی تائید میں استعمال کریں، ملحد علماء نے اس خلاء سے فائدہ اٹھایا، انہوں نے جدید معلومات کو غلط تعبیر کے ذریعہ اپنے غلط تعبیر کے ذریعہ اپنے حق میں استعمال کیا، جن واقعات سے دین توحید کا اثبات نکل رہا تھا، ان کو دینِ الحاد کی دلیل بنا دیا

اس کی ایک واضح مثال ارتقاء کا نظریہ ہے جس نے موجودہ زمانہ میں ملحدانہ فکر میں سب سے زیادہ اہم رول ادا کیا ہے ——

زمینی طبقات کے مطالعہ کے دوران انسان کے علم میں یہ بات آئی کہ قدیم زمانہ کے حیوانات کے ڈھانچے مخصوص کیمیائی عمل کے نتیجہ میں پتھر کی صورت اختیار کر گئے ہیں زمین کی کھدائی سے اس قسم کے بہت سے متحجر نمونے جمع کئے گئے۔ ان پر ریڈیو ایکٹیو ڈیٹنگ کا طریقہ استعمال کیا گیا تو تقریباً صحت کے ساتھ ان کی تاریخیں معلوم ہوگئیں۔ یہ تحقیقات سو سال سے بھی زیادہ لمبے عرصے تک جاری رہیں۔ یہاں تک انسان اس پوزیشن میں ہوگیا کہ مختلف انواعِ حیات کے درمیان تاریخ کے اعتبار سے ترتیب قائم کر سکے ——

اس تاریخی ترتیب سے معلوم ہوا کہ وہ تمام مختلف انواع حیات جو آج زمین پر بظاہر بیک وقت نظر آرہی ہیں وہ سب زمین پر بیک وقت موجود نہیں ہوگئیں بلکہ زمین پر ان کے ظہور میں ایک تاریخی ترتیب ہے۔ وہ یہ کہ سادہ انواع حیات سب سے پہلے ظہور میں آئیں۔ اس کے بعد بتدریج انواع حیات ظہور میں آتی رہیں۔ یہاں تک کہ بالآخر انسان ظاہر ہوگیا۔ اس طرح واحد الخلیہ جاندار زمین پر پہلے وجود میں آئے۔ اور انسان اس حیاتیاتی ترتیب کے سب سے آخر میں ظاہر ہوا ـــــــ

نظریہ ارتقاء کی عمارت جن مشاہدات پر قائم کی گئی ہے ان میں سب سے اہم مشاہدہ یہی ہے۔ نظریہ ارتقاء کے حامیوں کا کہنا ہے کہ یہ ترتیب بتاتی ہے کہ زندگی کی مختلف قسمیں ارتقائی عمل کے ذریعہ ظہور میں آئیں۔ یعنی زندگی کا ہر اگلا فارم اپنے پچھلے فارم سے نکلتا رہا۔ یہ ترقی ہر اگلی نسل میں جمع ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ اس کے آخری مجموعہ نے وہ اعلیٰ صورت اختیار کرلی جس کو انسان کہا جاتا ہے ـــــــ

مگر یہ سراسر غلط تعبیر کا نتیجہ ہے نہ کہ کسی حقیقی استدلال کا نتیجہ، خالص علمی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو جو بات مشاہدہ میں آئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ زمین پر انواع حیات کی موجودگی میں ایک زمانی ترتیب پائی جاتی ہے نہ یہ کہ انواع حیات ایک دوسرے کے بطن سے بطریق تناسل پیدا ہوتی چلی گئی ہیں ـــــــ

اصل مشاہدہ صرف تخلیق کی زمانی ترتیب کو بتا رہا تھا مگر غلط تعبیر کے ذریعہ اس کو زندگی کے ارتقائی ظہور کے ہم معنی بنا دیا گیا۔ ارتقاء کے مشاہدات خالق کی تردید نہیں کرتے، جیسا کہ خود چارلس ڈاروِن نے اپنی کتاب "اصل الانواع" میں تسلیم کیا ہے بلکہ اگر یہ مشاہدات درست ہیں تو وہ خالق کے تخلیقی عمل کی ترتیب کو بتاتے ہیں ـــــــ

یہ مختصر جائزہ یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ موجودہ زمانے میں اسلام کے احیاء کی راہ کا پہلا بنیادی کام اسلام کا فکری غلبہ ہے۔ مزید یہ کہ یہ فکری غلبہ بظاہر دشوار ہونے

کے باوجود انتہائی آسان ہے، اسلام کی پچھلی تاریخ میں اس سے ملتی جلتی مثالیں اس کے ثبوت کے لئے کافی ہیں ——

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عرب کے لوگ اسلام کے نہایت سخت دشمن کے روپ میں ظاہر ہوئے مگر صرف ربع صدی کی دعوتی جدوجہد نے بتایا کہ اس طاقتور دشمن کے اندر مددگار کی شخصیت چھپی ہوئی تھی۔ اس طرح ساتویں صدی ہجری میں تاتاری قبائل اسلام کے خلاف ناقابلِ تسخیر قوت بن کر ابھرے۔ مگر ایک صدی سے بھی کم عرصے میں معلوم ہوا کہ یہ طاقت ور تلوار صرف اس لئے ظاہر ہوئی تھی کہ بالآخر وہ اسلام کی طاقتور خادم اور محافظ بن جائے ——

یہی موجودہ زمانہ کے "اسلام دشمن" علوم کا معاملہ ہے ——

ان علوم نے بظاہر آج اسلام کو مغلوب کر رکھا ہے۔ لیکن اگر ہم اپنی کوششوں کو صحیح رخ سے جاری کر سکیں تو نصف صدی بھی نہیں گزرے گی کہ یہ سارا علم اسلام قبول کرلے گا، وہ اسلام کے علم کلام کی صورت اختیار کرلے گا اور پھر دنیا دیکھے گی کہ جدید علمی قوۃ صرف اس لئے ظاہر ہوئی تھی کہ وہ خدا کے دین کی طاقت ور و مددگار بن جائے ——

اسلام کے حق میں اس نتیجہ کو حاصل کرنے کی صرف ایک ہی ضروری شرط ہے وہ یہ کہ ہم دوسرے میدانوں میں اپنی جو قوت ضائع کر رہے ہیں، اس کو سمیٹ کر اسی ایک میدان "فکری انقلاب لانے کے میدان" میں لگادیں، جس دن یہ واقعہ ہوگا اسی دن اسلام کی نئی تاریخ بننا شروع ہو جائے گی۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ صحیح آغاز ہی دراصل صحیح اختتام کا دوسرا نام ہے ——

قرآن میں توحید کے

سادہ اور علمی انداز کا طریقہ

قرآن میں ہے کہ جو شخص اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو پکارے اس کے حق میں اس کے پاس کوئی دلیل نہیں (وَمَن یدعُ مع اللہ الٰھًا آخر لا بُرھان لہ بہ) ——— (المؤمنون ۱۱۷)

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے ایک عالم نے کہا کہ موحّد کہتا ہے کہ خدا ایک ہے، مُشرک کہتا ہے کہ خدا کئی ہیں، اسی طرح ایک خدا کا وجود دونوں کے درمیان متفق علیہ ہوگیا، کیونکہ مُشرک نے کہا کہ خدا کئی ہیں تو ایک خدا کو اس نے پہلے ہی مان لیا، اس طرح ایک خدا کا وجود تو اپنے آپ ثابت ہے۔ اب دلیل کی ذمہ داری موحد پر نہیں بلکہ مُشرک پر ہے۔ ایک کے بعد وہ خود خُداؤں کے وجود پر دلیل لائے ———

یہ سادہ استدلال کا ایک نمونہ ہے، ہر معاملہ میں استدلال کے دُو درجے ہوتے ہیں۔ ایک سادہ اور دُوسرا علمی، کچھ لوگوں کے لئے سادہ دلیل کافی ہوجاتی ہے مگر کچھ لوگ ہوتے ہیں جن کا تقاضا ہوتا ہے کہ زیادہ علمی انداز میں ان کے سامنے بات کو واضح کیا جائے، قرآن میں دونوں انداز کے دلائل موجود ہیں ———

اُوپر کی مثال بُرہان کی سادہ تفسیر ہے مگر اس بُرہان کی علمی اور سائنٹفک

تفسیر یہاں موجود ہے ۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب ہم کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں تو تمام حاصل شدہ شہادتیں خالق کی واحدانیت کی طرف اشارہ کرتی ہیں نہ کہ خالق کے تعدد کی طرف، مثلاً وسیع کائنات کے تمام اجزاء کا ترکیبی مادّہ صرف ایک ہے۔

پوری کائنات میں ایک ہی قانون کی کارفرمائی ہے۔ کائنات میں بے شمار سرگرمیاں ہیں مگر سب کی سب متوافق طور پر کام کرتی ہیں جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ان سب کا ناظم ایک ہی ہے، ——

کائنات کا کوئی جزء اپنے عمل کے دوران جب کوئی مسئلہ پیدا کرتا ہے تو اس کا دوسرا جزء فوراً اس کی تلافی کیلئے آجاتا ہے۔ تمام چیزیں جوڑے جوڑے کی شکل میں ہیں مگر دونوں میں اتنی یکسانیت ہے کہ دونوں بالکل کاگ وہیل کی طرح مل کر کام کرتے ہیں۔ اگر دونوں کے الگ الگ خدا ہوں تو دونوں میں اس طرح کا ہم آہنگی نہیں ہو سکتی ——

(وحیدُالدّین خان)

حق کی وضاحت کے بعد

اہل حق کو کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَشَاقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَھُمُ الْھُدٰی لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰہَ شَیْئًا وَسَیُحْبِطُ اَعْمَالَھُمْ (محمد ۳۲)

بے شک جن لوگوں نے انکار کیا اور اللہ کے راستے سے روکا اور رسول کی مخالفت کی جب کہ ہدایت ان پر واضح ہو چکی تھی وہ اللہ کو نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور اللہ ان کے اعمال کو ڈھا دے گا۔

اس آیت میں اس نوعیت کی دوسری آیتوں میں اللہ کے ایک نہایت اہم قانون کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ جو لوگ حق کا انکار کریں اور حق کے راستے میں رکاوٹ ڈالیں اور حق کے داعیوں کے مخالف بن کر کھڑے ہوں، وہ حق کا اور حق کے علمبردار کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، ان کی تمام مخالفانہ کارروائیاں عین قانونِ خداوندی کے تحت ناکام و نامراد ہو کر رہ جائیں گی ——

مگر اس کی ایک لازمی شرط ہے۔ وہ یہ کہ مخالفین وہ ہوں جن پر ہدایت کی تبیین کی گئی ہو جن کے اوپر امرِ حق پوری طرح واضح کیا جا چکا ہو ——

اس شرط کا تعلق مخالفین سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق خود حق کے داعیوں سے ہے حق کے داعیوں کی طرف سے اگر یہ شرط پوری کر دی گئی ہو تو یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ دشمنانِ حق کی کوئی بھی سازش یا کوئی بھی مخالفانہ کاروائی اہلِ حق کے اُوپر کارگر نہ ہو سکے گی۔ وہ اپنی تمام تدبیروں کے باوجود یقینی طور پر ناکام رہیں گے کہ حق کے داعیوں کو کوئی واقعی نقصان پہنچا سکیں ———

جب کچھ لوگ خالص حق کی دعوت لے کر اٹھیں اور اس کے تمام آداب و شرائط کے ساتھ اس کی تکمیل تک پہنچائیں تو اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ فریقِ ثانی کے اندر جتنی سعید رُوحیں شامل ہوتی ہیں وہ سب اللہ کی توفیق سے حق کو قبول کر کے حق پرستوں کے گروہ میں شامل ہو جاتی ہیں۔ اس طرح ان کی طاقت میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے اور جو لوگ تبیئن کے باوجود حق کے مُنکر بنے رہیں وہ اپنی دانستہ سرکشی کی بنا پر اس کے مستحق ہو جاتے ہیں کہ اللہ انہیں پکڑے اور ان کو مغلوب کر کے اہلِ حق کو ان کے اُوپر غلبہ عطا کر دے ———

(وحیدالدین خان)

الحمد للہ رب العالمین
میں معرفتِ الٰہیہ کی تشریح

اس کا لفظی مفہوم یہ ہے :۔

"ہر قسم کی تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو ساری کائنات کا پروردگار ہے"۔

یہ جملہ قرآنِ کریم کا حرفِ اوّل ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کو اجمال کے انداز میں بیان فرمایا ہے۔ الحمدُ میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہر قسم کی تعریف صرف اللہ ہی کیلئے کیجائے پھر اس کے بعد ایّاک نعبدُ و ایّاک نستعین میں بتلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ حمد یہ ہے کہ عبادت صرف اللہ ہی کی جائے اور اپنی ہر احتیاج کی تکمیل کے لئے اُسی ذات سے مدد طلب کی جائے۔

عبادت کی بُنیادی شرط یہ ہے کہ جس ذات کی عبادت کی جارہی ہے عابد کے علم اور یقین میں اُس ذات کا صحیح تعارف بھی موجود ہو۔ اس لئے ربّ العالمین کے جُملے میں اللہ نے پہلے اپنا اجمالی تعارف کرادیا ہے۔ تاکہ ہر عابد جب بھی حمد کی صورت میں اللہ کی عبادت کرے، اِس کے ذہن میں معبودِ حقیقی کا صحیح تصوّر پہلے موجود ہو ورنہ اس تصوّر میں جس قدر بھی نقص موجود ہوگا اس کی تمام عبادتیں بیکار ہو جائیں گی۔

ربّ العالمین میں اجمالی تعارف کی تلخیص یہ ہے :۔

(۱) کہ عالمین اضافت کے لحاظ سے ربّ کا مضاف الیہ ہے۔

- - - - - - - - - دو چیزوں کے درمیان اضافت اس لئے بیان کی جاتی ہے۔ جہاں مضاف الیہ اور مضاف میں حقیقی مغائرت پائی جاتی ہو۔ ورنہ دو چیزوں میں اضافت ظاہر کرنے کا کیا فائدہ ؟

اَب اِس کا مطلب یہ ہے کہ رَبّ اپنی جن مخصوص صفات کے ساتھ مختص ہے عالمین سے مغائرت کی وجہ سے اس پر مخلوق کی کسی صفت میں بھی مماثلت نہیں ہو سکتی اسی طرح عالمین کی ہر ہر نوع جن صفات کی حامل ہے۔ رَبّ سے مغائرت کی وجہ سے اس کی کسی نوع پر بھی الوہی صفات کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ غرضیکہ اس مغائرت نے خالق اور مخلوق کے درمیان ہر قسم کی مماثلت اور اتحاد کو ختم کر دیا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ ایک امام کا قول کا نقل کرتے ہیں کہ توحید یہ ہے :

اِفْرَادُ الْقَدِیْمِ عَنِ الْحَادِثِ	قدیم ذات کی اِس طرح تفرید اور تجرید بیان کی جائے کہ قدیم ذات اور کائنات میں حقیقی مغائرت ثابت ہو جائے

ربّ العالمین میں وحدت الوجود کے بنیادی عقیدے کی بھی اچھی طرح تردید موجود ہے کہ اضافت کی وجہ سے جب عالمین اور رَبّ میں حقیقی مغائرت ثابت ہو رہی ہے۔ تو پھر اِن دونوں کے درمیان عینیّت اور وحدت کس طرح قائم ہو سکتی ہے۔ اسی طرح کوئی مخلوق اللہ کی کسی صفت کی مظہر کیسے بن سکتی ہے۔ اس لئے کہ ظاہر اور مظہر کے وجود میں جب تک کسی قسم کی مشارکت نہ مانی جائے، کوئی وجود اپنی کسی صفت کو کسی مظہر میں بھی منعکس نہیں کر سکتا، وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے جتنے اکابر گذرے ہیں وہ مخلوق کو مظہرِ الٰہی ثابت کرنے کے لئے یہ مثال دیتے ہیں کہ جس طرح آئینہ میں سورج کی شعاعیں منعکس ہو جاتی ہیں۔ اِسی طرح صفاتِ الٰہی بھی اپنے مقرّبین بندوں میں

ظاہر ہو جاتی ہیں لیکن وہ حضرات اس مثال سے یہ بات بھول گئے کہ سورج اور آئینہ کی مثال میں شعاعوں کا انعکاس اس لئے صحیح ہے کہ وہ دونوں محسوسات سے تعلق رکھتے ہیں اور یہاں مقربین کا وجود تو محسوسات سے تعلق رکھتا ہے لیکن اللہ کی ذات غیر مرئی اور غیر محسوس ہے اس لئے اس کی کوئی صفت بھی محسوس مخلوق میں منعکس نہیں ہو سکتی۔ دیکھئے! اضافت کی اس مغائرت نے دنیا کے کتنے اتحادی وجودی اور شرکیہ نظریات کا ابطال کر دیا ہے ——

۲ —— ربّ العالمین میں معرفت کی ایک تعبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام عالمین کا ربّ ہے اور عالمین کا ذرّہ ذرّہ اس ربّ کا مربوب ہے۔ مربوب چیز وہ ہوتی ہے جو اپنے وجود کی تکمیل کے لئے کسی دوسرے کی محتاج ہو۔ ربّ کا مفہوم یہ ہے، امام راغبؒ فرماتے ہیں :——

هُوَ اِنْشَاءُ الشَّيْ حالاً فحالاً الى حد التمام ——	یعنی کسی چیز کو اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق اس طرح بتدریج نشوونما دیتے رہنا کہ وہ چیز اپنی استعداد کے مطابق حدِ کمال کو پہنچ جائے ——

مثلاً جب بچّہ پیدا ہوتا ہے اگر اس کی پیدائش کے بعد اس دنیا میں اس کی نشوونما کا انتظام نہ کیا جائے تو وہ اپنی طبعی عمر کو کیسے پہنچ سکتا ہے۔ اسی طرح کائنات کی ہر چیز اپنے آغاز سے لے کر انجام تک اپنے وجود کے بقاء کے لئے ہر وقت اللہ کی ربوبیت کی محتاج رہتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا اس کائنات کی ہر مخلوق اپنی تخلیق کے لحاظ سے اتنی ناقص اور محتاج ہے کہ جب تک ربّ کی ربوبیت اس کی بقاء کا انتظام نہ کرے کوئی چیز بھی اپنے وجود کو اس دنیا میں قائم نہیں رکھ سکتی۔ قرآن میں جہاں جہاں

رب کا اسم استعمال کیا گیا ہے آپ دیکھیں گے وہاں اُس کے ساتھ کسی نہ کسی مربوب کا ذکر بھی ضرور شامل ہوگا ____

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا وجود کائنات میں سب سے برتر ہستی ہے۔ قرآن کے اکثر مقامات میں آپ کو ربّک کی اضافت کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے جیسے واذکر اسم ربّک۔ سبح اسم ربّك۔ اس میں ربّک کا مفہوم یہ ہے کہ اے رسول جب تیری ہستی اپنی بقا کے لئے اس کی ربوبیت کی محتاج ہے تو آپ پہ لازم ہے کہ آپ بھی اپنے ربّ کی تسبیح اور تقدیس کرتے رہیں۔ دُعاؤں کی آیات میں اکثر ربّنا کا لفظ آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے ربّ، جب ہمارا وجود تیری ربوبیت کے سہارے قائم ہے تو ہمارے ان مصائب کو بھی تو ہی دُور کرسکتا ہے ____ اس سے معلوم ہُوا کہ کائنات کی ہر مخلوق جب اپنے وجود کی بقا کے لئے ہر وقت اُس کی ربوبیت کی محتاج نظر آتی ہے۔ تو وہ مخلوق جو خود محتاج اور عاجز ہے وہ دوسری مخلوق کی کس طرح سہارا بن سکتی ہے۔ مُشرکین جن انبیاء اور اولیاء کو اپنے مصائب میں سہارا بنائے ہوئے ہیں۔ اُنہیں یہ آیت چیلنج کررہی ہے۔ جب تک آپ لوگ ان قدسی نفوس کو عالمین سے خارج نہ کریں گے وہ مربوب اور عاجز ہونے کی وجہ سے کوئی مُصیبت بھی دُور نہیں کرسکتے:____

اس آیت میں ربّ العالمین کا مفہوم دیکھئے:____

فَلِلّٰہِ الحمدُ ربّ السمٰوٰتِ وربّ الارض ربّ العالمین وَلہ الکبریاء فی السمٰوٰت والارض وھوالعزیزالحکیم____	پس ہر قسم کی ستائش صرف اللہ کے لئے ہے۔ جو آسمانوں اور زمینوں اور کائنات کے ذرّہ ذرّہ کا پروردگار ہے ____

دیکھیے۔! اس آیت میں عالمین کو علیحدہ علیحدہ ذکر کرکے پھر اس کے ساتھ آسمانوں

اور زمینوں کو بھی شامل کر دیا ہے۔ تاکہ معلوم ہو سکے۔ اس کائنات کی ہر مخلوق عالمین کے اثر میں شامل ہے۔ جو مجموعی طور پر اس کی ربوبیت کی ہر وقت محتاج ہے۔

۳ ــــ عالمین کے لفظ میں معرفتِ الٰہی کی ایک اہم دلیل یہ ہے۔ عالمین لفظ عالَم کی جمع ہے۔ عالَم بروزن خاتَم ہے۔ جو اسم آلہ کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے خاتَم اُس انگوٹھی کو کہتے ہیں جس کے ساتھ اہم دستاویز پر مُہر لگا دی جاتی ہے پس اِسی طرح عالَم کا مفہوم وہ علامت ہے۔ مَا یُعْلَمُ بِہِ الشَّیْءُ جس کے ذریعے کسی چیز کو معلوم کیا جا سکے۔ پس یہاں ساری کائنات کو عالمین اس لئے کہا گیا ہے۔ اس میں جتنی بھی مخلوق ہے عَالَم یعنی علامت اور دلیل ہونے کی وجہ سے کسی ہستی کے موجود ہونے کی نشاندھی کر رہی ہے ــــ

قاعدہ یہ ہے جہاں کوئی چیز بطور علامت استعمال ہوتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس علامت سے اس کا مدلول دریافت ہو سکے۔ جیسے تیز دھوپ کی علامت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سُورج آسمان پر پوری تمازت کے ساتھ موجود ہے اِسی طرح کائنات کی ہر چیز جو اپنے اپنے مقام پر قائم ہے۔ اس بات کی علامت ہے کہ وہ کسی قائم کرنے والی ہستی کی نشاندہی کر رہی ہے۔ کوئی طویل چھت دیواروں اور ستونوں کے بغیر کھڑی نہیں ہو سکتی ــــ لیکن آسمان کو دیکھئے کہ وہ کس طرح طویل اور بُلند ہونے کے باوجود ستونوں کے بغیر ایک ہی سطح پر قائم ہے اس کا ستونوں کے بغیر قائم ہونا اِس بات کی علامت ہے کہ کوئی ایسی ہستی ضرور موجود ہے جو اپنی قدرت سے اِتنی وسیع عمارت کو تھامے ہوئے ہے۔ ورنہ ایسی بلند اور وسیع چھت کسی سہارے کے بغیر کس طرح قائم رہ سکتی ہے۔ جب ایک لفظ میں چند حروف ایک ترتیب سے رکھے جاتے ہیں۔ تو وہ لفظ ایک مُسمّٰی وجود کے مفہوم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جیسے شین، یا اور را کو ملانے سے شیر کا لفظ بن جاتا ہے جس سے

ہم معلوم کر لیتے ہیں کہ اس سے ایک طاقت ور جانور مراد ہے۔ اسی طرح مخلوق کی ہر ہر چیز حرف کی شکل میں کائنات کی وسیع سطح پر پھیلی ہوئی ہے۔ ایک صاحب بصیرت جب اس کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کے الفاظ ڈھل ڈھل کر ایک ایسا مفہوم پیدا کر دیتے ہیں جس سے معرفت الٰہی خوب آشکارا ہو جاتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی مشرک قوم سورج اور چاند کے وجود کو اپنا ربّ سمجھے ہوئے تھی وہ صرف ان کی روشنی اور حدّت سے متاثر تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام جو ایک صحیح بصیرت کے حامل تھے، انھوں نے جب سورج کا مشاہدہ کیا کہ واقعی سورج اپنی حدّت اور روشنی میں بڑا کمال رکھتا ہے لیکن غروب ہونے کے بعد جب اس کی روشنی اندھیرے میں تبدیل ہو گئی تو آپ نے فرمایا یہ کیسے ربّ ہو سکتا ہے جو اپنے وجود کو ایک جگہ تھام سکتا ہے اور نہ اس کی روشنی اندھیرے کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ ہم ایسے بھاگنے اور چھپنے والوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے، دیکھئے وہ مشرک لوگ صرف سورج کی حدّت اور روشنی کی وجہ سے اُسے اپنا ربّ بنائے ہوئے تھے، لیکن اس کا غروب ہونا جو اس کی کمزوری اور تغیّر کی اہم دلیل تھی وہ اس دلیل کے مفہوم کو قطعاً نہ سمجھ سکے کیونکہ جو چیز اپنی کامل حالت کے بعد ناقص حالت میں تبدیل ہو جاتی ہے اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے وجود پر کسی دوسری ہستی کا تغلّب ہوتا ہے۔ جو اس چیز کے کامل وجود کو ایک ناقص حالت میں تبدیل کر دیتی ہے ——— اس سے معلوم ہوا کہ کوئی متغیّر اور ناقص چیز الوہیّت کے ساتھ متصف نہیں ہو سکتی اب آخر میں اس بات کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ ہمیں جس حمد کے بیان کرنے کا حکم دیا گیا ہے اُس حمد کا طریقہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ الحمد للہ میں پہلے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر ستائش کا مستحق ہے، پھر اس دعویٰ کے مدلول پر یہ دلیل لائی گئی ہے۔ وہ ذات چونکہ ساری کائنات کی پروردگار ہے، اس لئے وہ ہی ہر ستائش اور حمد کی مستحق ہو سکتی ہے۔ اب حمد کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ہم

ربّ العالمین میں مغائرت ثابت کر کے تمام کائنات کو اس کا محتاج اور مربوب سمجھیں اور ربّ کو کائنات کے ذرّے ذرّے کا مربّی اور پروردگار سمجھیں۔ اس عقیدے کے اظہار کو اللہ کی حمد کہتے ہیں۔ اور اس حمد کی عملی صورت کو اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے ——— اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور جب تو نے ساری کائنات کو اپنا مربوب اور محتاج ثابت کر دیا ہے ——— اس لئے کسی دوسرے سے نہیں بلکہ ہم اپنی ہر حاجت میں تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی حمد کرنے کا عملی طریقہ یہ ہے جیسے ایاک نعبد و ایاک نستعین میں بیان کیا گیا ہے۔ حمد کے اس طریقۂ قویم کا نام صراطِ مستقیم ہے۔ جو لوگ اس طریقہ پر چلتے رہے ہیں۔ ان کا ذکر اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ میں کیا گیا ہے۔ اب لازم تھا کہ ان انعام یافتہ نفوس کو اس کا بہترین صلہ بھی دیا جائے۔ اور جن لوگوں نے اس طریقہ قویم کو اپنے اختیار سے چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر رکھا تھا۔ انہیں بھی اس نافرمانی کی پوری سزا دی جائے ———

مَالِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ میں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ ہم نے ایک ایسا دن مقرر کر دیا ہے جہاں پر ہر سعید اور شقی کو اپنے اپنے عمل کا پورا معاوضہ مل جائیگا۔ اسلام میں سب سے زیادہ جس عبادت میں عملی توحید کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ نماز ہے۔ حدیث میں ہے نماز کی جو اصل روح ہے وہ سورہ فاتحہ ہے۔ اس کو ہر نماز میں اس لئے فرض کیا گیا ہے کہ اس سورۃ کا جو بنیادی مفہوم ہے وہ ہر نمازی کے عقیدے میں ہر وقت مستحضر رہے اور یہ ایسا مفہوم ہے جس کے استحضار سے نمازی (واسجد واقترب) تقرّبِ الٰہی کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ حدیث میں ہے جب انسان نماز کو چھوڑ دیتا ہے تو وہ کفر کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس عمل سے تقرّب الٰہی حاصل ہو سکتا تھا، جب اُسے عمداً چھوڑ دے گا تو لازماً رفتہ رفتہ کفر کے کنارے تک پہنچ جائیگا۔

خلاصۃ المقصود

۱ــــ الحمد للہ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ ہر قسم کی عبادت اور حمد کا مستحق صرف اللہ ہے۔ رب العالمین میں اس دعویٰ کی دلیل بیان کی گئی ہے۔ جو ذات کائنات کو معدوم سے موجود کر کے اس کی ہر مخلوق کی پرورش کر رہی ہے وہی ذات ہر قسم کی عبادت کے لائق ہو سکتی ہے ــــ

۲ــــ معرفت کی پہلی دلیل یہ ہے کہ رَبّ اور عالمین کے تعلّق کو اضافت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ دو چیزوں کے درمیان اضافت چونکہ مغائرت پیدا کر دیتی ہے۔ اس لئے رَبّ کو ایسے دُرجے میں رکھا جائے کہ اس کی کوئی صفت بھی مخلوق پر ثابت نہ ہو سکے اور عالمین میں جتنی مخلوق شامل ہے اُسے کسی ایسی صفت سے موصوف نہ کیا جائے جو رَبّ کی کسی صفت کے ساتھ مماثلت رکھتی ہو۔ عیسائی اپنے عقیدۂ تثلیث میں حضرت عیسیٰ پر بھی الوہیت کی اسی صفت کا اطلاق کرتے ہیں جس الوہیت کے ساتھ اللہ کی ذات مختص ہے۔ اس کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے ربّ العالمین میں حقیقی مغارت کو ملحوظ نہیں رکھا، نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت عیسیٰؑ جو عالمین کی مخلوق میں شامل تھے وہ رَبّ کے درجے میں شامل ہو گئے اور اللہ تعالیٰ اپنی الوہیت سے گر کر حضرت عیسیٰؑ کے برابر ہو گئے۔ جن حضرات کے نزدیک حقیقۃ محمدیہ کی وجہ سے ذات نبویّہ پر رَبّ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ علّامہ کاظمی لکھتے ہیں۔ اس عقیدے کا مبنیٰ وحدۃ الوجود کا نظریہ ہے۔ اور وحدۃ الوجود ایک ایسا نظریہ ہے جو مسلمانوں کے اکثر مسالک میں

مسلّم ہے۔ اس لئے ایسے عقیدہ والوں کی تکفیر کرنا اُمّت مسلمہ کی پوری اکثریت کی تکفیر ہو جاتی ہے۔ دیکھئے، اس عقیدہ کی بنیادی غلطی بھی یہی ہے۔ چونکہ وحدت الوجود کے نظریئے میں کائنات اور خدا کے درمیان حقیقی عینیت اور وحدۃ ثابت ہو جاتی ہے۔ اس لئے ذات نبویہ جو کائنات میں داخل تھی مغائرت کے ارتفاع سے ربوبیت کے درجہ میں داخل ہو گئی۔ منصور حلاج نے بھی انا الحق اس لئے کہا تھا اس کے نزدیک فنا کا یہ مفہوم تھا جہاں قدیم اور حادث کے درمیان مغائرت مرتفع ہو جاتی ہے' ابن عربی اپنی کتاب فصوص الحکم میں لکھتا ہے کہ فرعون کا یہ قول کہ میں رَبّ ہوں۔ اس کا یہ قول اس لئے صحیح تھا کہ اسے بھی ہمارے نظریئے کے مطابق خدا کے ساتھ عینیت حاصل تھی دیکھئے الحمدللہ رب العالمین میں مخلوق اور خالق کے درمیان مغائرت کو ملحوظ نہ رکھنے سے کس طرح یہ لوگ جادۂ قویم سے بھٹکتے رہے ہیں ——

۳ — معرفت کی دوسری دلیل یہ ہے کہ رَبّ پر ربوبیت کا اطلاق ہوتا ہے اور عالمین کی ہر مخلوق مغائرت کی وجہ سے مربوبیت میں داخل ہو جاتی ہے ہر مربوب چونکہ اپنی بقا کے لئے ہر وقت رَبّ کا محتاج ہوتا ہے اس لئے وہ کسی دوسرے کی قطعاً مدد نہیں کر سکتا۔ ایاک نستعین کا یہی مفہوم ہے کہ اے اللہ! ہم ہر مصیبت میں تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں۔ انبیاء اور اولیاء سے اس لئے مدد طلب نہیں کرتے کہ وہ مربوب ہونے کی وجہ سے وہ خود ہی اپنے حوائج میں محتاج اور عاجز نظر آتے ہیں ——

۴ — معرفت کی تیسری دلیل یہ ہے، عالمین لفظ عالَم کی جمع ہے۔ عالَم اس علامت کو کہتے ہیں جس کے نشان سے کسی دوسری ہستی کی نشاندہی ہو سکے، اس لئے قرآن میں ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ کائنات کی ان چیزوں میں تدبّر کریں تاکہ تم ان کی تنظیم اور تزئین کا مشاہدہ کر کے ذات باری کے خالق اور فاطر ہونے کا اقرار کر سکو ——

سارے رسولوں نے توحید کی دعوت میں سب سے پہلے جس آفاقی دلیل کو پیش کیا ہے وہ یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ ساری کائنات کا فاطر ہے اس لئے اس کی ذات میں کسی قسم کے ترداد

شک کی گنجائش نہیں ہو سکتی ——

قالت لهم رسلهم
افی الله شك
فاطر السموات والارض
(القرآن)

ہر رسول اپنی اپنی قوم کو توحید سمجھانے میں یہی دلیل پیش کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ ساری کائنات کا فاطر ہے تو اتنی مضبوط دلیل کے بعد اب اس کی ذات میں کس طرح تردّد ہو سکتا ہے،

معرفتِ الٰہیہ کے یہی بنیادی اصول ہیں جن پر انسان کی ابدی نجات موقوف ہے۔

قرآن میں

توحید اور شرک کا مفہوم ــــ!

(سید سلیمان ندوی)

اسلام سے پہلے جو مذاہب تھے باوجود اس کے کہ خدا کی توحید اور صفات پر ایمان رکھنا ان کے اصول میں بھی داخل تھا۔ مگر ان کی تعلیمات میں ترتیب مفقود تھی اور یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ان کی نگاہ میں توحید کا مسئلہ اہمیت کس درجہ پر ہے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم نے اس مسئلہ کی اہمیت اصلی محسوس کی ـــــ خدا اگر چاہے تو انسان کے تمام گناہوں سے درگزر کر سکتا ہے مگر اسی ایک حقیقت سے انکار وہ جرم ہے جس کو وہ کبھی مُعاف نہ فرمائے گا ـــــ

اِنَّ اللہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (نساء ۱۸)	یقیناً خدا شرک کو مُعاف نہ کرے گا اور اس کے سوا جس کے جو گناہ چاہے مُعاف کر دے ـــــ

اصلاحِ عقائد عرب میں جہالت اور وحشت کی وجہ سے سینکڑوں غلط عقائد اور توہمات پھیل گئے تھے اور دُنیا کے دوسرے مذاہب کے عقائد میں بھی بہت سی غلطیاں داخل ہو گئی تھیں، ان میں سب سے زیادہ بدتر اور تمام

برائیوں کا اصلی محور شرک تھا، اس لیے سب سے پہلے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس کی اصلاح سے آغاز کیا ــــ

شرک اور بت پرستی کا اصلی زینہ اسباب و مؤثرات کا وجود ہے، خدا نے عالم میں ایک سلسلۂ اسباب قائم کر دیا ہے اور عالم کے واقعات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں لیکن یہ تمام سلسلہ ایک قادرِ مطلق کے دستِ قدرت میں ہے اور اس سلسلہ کی ایک کڑی بھی اس کے اشارہ کے بغیر جنبش نہیں کر سکتی۔ شرک اس طرح شروع ہوتا ہے کہ پہلے انسان اسباب و علل میں سے بعض نمایاں اور قوی الاثر اسباب سے متاثر ہوتا ہے، اجرامِ فلکی کی عظمت، آفتاب و ماہتاب کی نور افشانی، سمندر کا پُرزور تلاطم، عناصر کی نیرنگ آرائیاں، انسان کو مبہوت کر دیتی ہیں وہ ان کی عظمت و تاثیر سے متاثر، پھر منفعل اور بالآخر ان کا غلام بن جاتا ہے، اعتقاد کے پہلے مرحلہ میں انسان غور رسی کے دعوی سے اس قدر امتیاز اور تفریق پیدا کرتا ہے کہ یہ چیزیں خود خدا یا معبود نہیں ہیں لیکن یہ تمیز آخر تک قائم نہیں رہتی بلکہ رفتہ رفتہ خوش اعتقادی کا اثر غالب آتا جاتا ہے اور یہ چیزیں خدا کی شریک بنتی جاتی ہیں یہاں تک کہ اصلی مسبب الاسباب نظر سے بالکل اوجھل ہو جاتا ہے ــــ

شرک کی جو گوناگوں صورتیں دنیا میں موجود ہیں اور جس طرح آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان کا استیصال کیا ان کی تفصیل حسب ذیل ہے ــــ

(۱) ــ دنیا کی مشہور قوموں میں سے عیسائی اور مجوسی اعلانیہ مشرک تھے یعنی تین اور دو خدا مانتے تھے، ہندو بھی اسی کے قریب قریب تھے ان مذہبوں کی ابتدا، اس طرح ہوئی کہ خدا کے جو مختلف نمایاں اور اہم اوصاف ہیں، ان کا مستقل اور مجسّم وجود قائم ہو گیا، مثلاً صفتِ خلق اور احیا، و امانت برہما، بشن، مہیش کے نام سے موسوم ہیں۔ مجوسیوں کے شرک کی بنیاد اس پر تھی کہ افعالِ خیر و شر کا ایک خالق نہیں

ہو سکتا، ورنہ لازم آئے گا کہ خدا شر کو پیدا کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص برائی کے پیدا ہونے کو جائز رکھتا ہے وہ خود اچھا نہیں ہو سکتا ——

اسلام نے اس مسئلہ کی جس اصلی گرہ کو کھولا ہے وہ یہ ہے کہ اشیاء بذاتہ خیر و شر نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے صحیح یا غلط طریقۂ استعمال سے خیر و شر ہو جاتی ہیں۔ آگ بجائے خود نہ خیر ہے نہ شر اگر اس سے اچھا کام لیا جائے تو خیر ہے اور برا لیا جائے تو شر ہے۔ زہر نہ اچھا ہے نہ برا ہے۔ اگر اس کو بیماریوں کے استیصال میں استعمال کیا جائے تو خیر ہے اور اگر کسی بے گناہ کے قتل میں استعمال کرو تو شر ہے ——

اسی طرح دوسری اشیاء کے بھی خیر و شر کے دونوں پہلو ہیں۔ نہ کوئی شے دنیا میں خیر مطلق ہے نہ کوئی شر محض —— اسی لئے قرآن نے شر کی نسبت خدا کی طرف نہیں کی ہے بلکہ خود انسان کی طرف کی ہے ——

مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (نساء ۱۱)	تجھ کو جو نیکی پہنچی، تو وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو مصیبت پہنچی وہ خود تیری طرف سے ہے

حاصل یہ کہ اس دنیا میں جب خیر و شر اشیاء میں بذاتہ نہیں ہیں تو اچھی چیزوں کیلئے الگ اور بری چیزوں کے لئے الگ خالق تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ خالق ایک ہی ہے دو نہیں ہیں ——

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنَ وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ـ	اور خدا نے کہا کہ دو خدا نہ بناؤ وہ ایک ہی خدا ہے تو مجھی سے ڈرو اور اسی کے لئے ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے ——

بزرگوں کی مُشرکانہ تعظیم سے روکنا

(۲) شرک کا بہت بڑا ذریعہ کسی خاص شخص کسی خاص شے کی تعظیم مفرط ہے جس کو شخص پرستی یا یادگار پرستی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام، رام چندر کرشن وغیرہ کو اسی خوش اعتقادی نے آدمی سے خُدا بنا دیا، اس بنا پر قرآن مجید میں نہایت پُرزور اور پُر رعب الفاظ میں شخص پرستی کی تحقیر کی گئی ——

یَآاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ —— (نساء) ۲۳	اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں حد سے زیادہ نہ بڑھ جاؤ اور خدا کی نسبت وہی کہو جو حق ہے، مسیح یعنی عیسیٰ ابنِ مریم صرف خدا کے پیغمبر ہیں ——

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم باوجود کہ وہ ایک عظیم مرتبت کے حامل تھے لیکن بار بار قرآن مجید میں تاکید آتی تھی ——

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُوْحٰٓى اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (کہف ۱۲)	کہہ دے اے پیغمبر کہ میں تو تمہاری ہی طرح آدمی ہوں لیکن یہ کہ میری طرف وحی بھیجی جاتی ہے کہ تمہارا خدا ایک خدا ہے ——

اس میں عبدیّت کا وصف رسالت پر مقدّم ہے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایک دفعہ بعض کُفّار کے حق میں دُعائے بد کی۔ اس پر یہ آیت اُتری ——

لَیْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْهِمْ اَوْ یُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ (آل عمران)	تم کو کچھ اختیار نہیں ہے، خدا چاہے گا تو ان پر توجّہ کرے گا یا ان کو عذاب دے گا کہ وہ ظالم ہیں۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم بعض کفّار کی ہدایت پانے اور اسلام قبول کرنے کے نہایت خواہشمند تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی ——

اِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ اَحْبَبْتَ (قصص)	تم جس کو چاہتے ہو اس کو ہدایت نہیں کر سکتے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے عبدُاللہ بن ابی کیلئے دُعائے مغفرت کی اس پر قُرآن مجید میں آیا ——

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (توبہ : ۱۰) ——	تم ان کے لئے مغفرت چاہو یا نہ چاہو، اگر تم ان کے لئے ستّر دفعہ بھی مغفرت چاہو گے تو خدا انکی مغفرت نہ کرے گا ——

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم ہمیشہ ہر موقع پر اس اَمر کی تاکید اور اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ لوگ آپؐ کی زائد از اعتدال مدح نہ کریں جو منجر ہو کر شرک تک پہنچ جائے —— بار بار فرماتے تھے ——

لا تطرونی کما اطری الیھود و النصاری ——	میری شان میں اس طرح مبالغہ نہ کرو جس طرح یہود و نصاریٰ نے اپنے پیغمبروں کی شان میں کیا۔

درمیانی واسطوں کا مُشرکانہ اعتقاد

(۳) شرک کا اصلی ضرر یہ ہے کہ خدا سے انسان کو جس درجہ کا تعلّق جس قسم کا عجز و نیاز جس مرتبہ کی مجبّت، جس درجہ کی التجا درکار ہے، اس کا رُخ دُوسری جانب بدل جاتا ہے، ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں جو اچھّی طرح جانتے ہیں کہ دیوتا کائنات اور زمین و آسمان کے خالق نہیں ہیں تاہم وہ ہر قسم کی حاجتیں اور مُرادیں ان ہی دیوتاؤں

اور معبودوں سے مانگتے ہیں، ان ہی کو حاجت روا جانتے ہیں، اُٹھتے بیٹھتے ان ہی کا نام لیتے ہیں، ان ہی پر نذر و نیاز چڑھاتے ہیں۔ غرض براہِ راست ان کو جو تعلق ہوتا ہے ان ہی معبودوں سے ہوتا ہے، خود مسلمانوں میں ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا طرزِ عمل انبیاء و صلحاء بلکہ مزارات کی نسبت اس کے قریب قریب ہے۔ اس بناء پر مقدم ترین امر یہ ہے کہ معبودوں کی نسبت اس قسم کا خیال نہ پیدا ہونے پائے بلکہ صاف صاف بتا دیا جائے کہ خدا کے آگے کسی کی کچھ نہیں چل سکتی اور اس کی مرضی میں کوئی دست اندازی نہیں کر سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے طلبِ مغفرت کا وعدہ کیا تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا:—

لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ —(ممتحنہ ۱)	میں آپ کے لئے مغفرت کی درخواست ضرور کروں گا لیکن مجھ کو خدا کے سامنے آپکی نسبت کوئی اختیار نہیں۔

قرآن مجید میں نہایت کثرت اور نہایت تشدد کے ساتھ اس مضمون کو ادا کیا گیا کہ تم جن لوگوں کو حاجت روا سمجھتے ہو اور جن سے حاجتیں مانگتے ہو، ان کو کارخانۂ ہستی میں کسی قسم کا اختیار نہیں —

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ۞ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ	کہہ دو کہ خدا کے علاوہ تم جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری مصیبت کو ہٹانے یا بدلنے کا کچھ اختیار نہیں رکھتے جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں، وہ بھی زیادہ قرب حاصل کرنے کیلئے خود خدا ہی کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں اور اس کی رحمت کے اُمیدوار رہتے ہیں

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ۔ (بنی اسرائیل : ۶)	اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بیشک تیرے ربّ کا عذاب ڈرنے کے قابل ہے ــــــ

خوارق خدا کے حکم سے ہوتے ہیں

(۴) شرک کا ایک بڑا ذریعہ خوارق عادات کی نسبت غلط فہمی ہے، جن اشخاص سے خوارق عادت سرزد ہوتے ہیں، ان کی نسبت لوگوں کو پہلے یہ خیال آتا ہے کہ یہ خود خدا نہیں ہیں لیکن اُن میں خُدائی کا شائبہ ضرور ہے ورنہ ایسے افعال کیونکر سرزد ہوتے جو قدرتِ انسانی سے بالاتر ہیں۔ یہی خیال رفتہ رفتہ دیوتا اور اوتار تک ترقی کرتا ہے، اور بالآخر خدائی تک پہنچا دیتا ہے ــــــ

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہوتا کہ انبیاء علیہم السّلام سے معجزات صادر ہوتے ہیں اور یہ امر خصائص نبوّت میں سے ہے، تاہم یہ مسئلہ اسلام کے زمانہ تک مشتبہ اور مجمل رہا، قرآن مجید میں اس کے متعلق حسب ذیل امور بیان کئے گئے ہیں ـــ

(۱) معجزات صادر ہوسکتے ہیں اور خدا اپنے مقبول بندوں کو معجزات عطا کرتا ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ (انعام : ۴)	اور کفّار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرتؐ) پر کوئی معجزہ خدا کے یہاں سے کیوں نہیں اُترا، کہہ دو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ معجزہ نازل کرے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ــــــ

(۲) باوجود اس کے کفّار کو معجزہ طلبی سے روکا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ نبوّت اور رسالت معجزہ پر موقوف نہیں ــــــ

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ	اور کفّار کہتے ہیں کہ ہم تم پر ایمان

أُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۔ (رعد : ۱)

نہ لائیں گے جب تک تم زمین سے چشمہ نہ نکال دو یا تمہارے پاس کھجوروں یا انگوروں کا باغ نہ ہو۔

حرام وحلال کرنا خدا کا کام ہے

(۶) شرک کی ایک قسم یہ بھی تھی کہ انبیاء یا پیشوایان مذہبی کو تحریم و تحلیل کا مجاز سمجھتے تھے یعنی وہ جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں اور جس چیز کو چاہیں حلال ٹھہرادیں، قرآن مجید میں جب یہ آیت اُتری —

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا ۔ (توبہ، ۵)

ان لوگوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو رب بنا لیے۔

تو حضرت عدیؓ نے جو حاتم طائی کے فرزند اور اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ ہم لوگ اپنے پیشوایان مذہبی کو اپنا رب تو نہیں سمجھتے تھے، آپؐ نے ارشاد فرمایا کیا تم لوگوں کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ یہ لوگ جس چیز کو چاہیں حلال اور جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں، عرض کیا کہ ہاں۔ آپؐ نے فرمایا یہی رب بنانا ہے[۱]

غیر خُدا کی مُشرکانہ تعظیم

(۷) شرک کا ایک بڑا ذریعہ یہ تھا کہ جو اعمال اور آداب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں وہ اوروں کے ساتھ بھی برتے جاتے تھے، یہ اگرچہ شرک فی العبادۃ یا شرک فی الصفات ہے لیکن رفتہ رفتہ شرک فی الذات تک منجر ہوتا ہے، سجدۂ عبادت خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن کفار اور دیگر اہل مذاہب بتوں اور مقتدایانِ دینی کو بھی سجدہ کرتے تھے اور سلاطین و امراء کو تو سجدہ کرنا عام طور سے رائج تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت سختی سے اس کو روکا —

---

[۱] — جامع ترمذی و ابنِ کثیر تفسیر آیت مذکور —

صفاتِ الٰہی کی توحید

(۸) شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ خُدا کے ساتھ جو اَوصاف مخصوص ہیں وہ اَوروں میں تسلیم کیے جائیں جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ وہ شرکتِ وصف کی بنا، پر خدا کے شریک اور ہمسر بن جائیں ان میں سے ایک وصف علمِ غیب ہے، اکثر اہل مذاہب اعتقاد رکھتے تھے اور اب بھی رکھتے ہیں کہ انبیا، اور اولیا، کو علمِ غیب ہوتا ہے، بنی اسرائیل کے زمانہ میں کاہنوں کا یہی کام تھا کہ وہ آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کیا کرتے تھے کبھی فال سے، کبھی پانسے پھینک کر اور کبھی یہ ظاہر کر کے ان کو جنّات غیب کا حال بتا جاتے ہیں ــــ

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے نہایت تاکید اور استقصاء کے ساتھ اس اعتقاد کو مٹایا اور علمِ غیب کی تمام صورتیں باطل کیں، خود قرآن مجید میں نہایت کثرت سے اس کے متعلق آیات نازل ہوئیں

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا اِلَّا هُوَ (انعام : ۷)	اور خدا کے پاس غیب کی کُنجیاں ہیں جن کو خدا کے سِوا کوئی نہیں جانتا

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس اجمال کی تفصیل بیان فرمائی اور فرمایا کہ :۔
مفاتحِ غیب پانچ ہیں جن کو خدا کے سِوا کوئی نہیں جانتا ــــ

۱ ــــ حمل یعنی لڑکا ہوگا یا لڑکی ــــ

۲ ــــ کل کیا ہوگا ــــ

۳ ــــ بارش کب ہوگی ــــ

۴ ــــ کس جگہ موت آئے گی ــــ

۵ ــــ قیامت کب آئے گی ــــ

اگرچہ علمِ غیب اور بھی صورتیں ہیں لیکن زیادہ تر ان ہی امور کی نسبت لوگ علمِ غیب کے مدعی تھے اور غیب کی ان ہی باتوں کو لوگ پہلے سے جاننے کے خواہشمند

ہوتے ہیں ——— یہاں تک کہ خود اپنی ذات سے بھی علمِ غیب کی نفی کی، ایک دفعہ ایک شادی کے موقع پر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم تشریف فرما تھے، انصار کی چند لڑکیاں گا رہی تھیں، گاتے گاتے انھوں نے یہ گانا شروع کیا ———

وفینا رسول یعلم ما فی غد ———	اور ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے ———

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے منع فرمایا کہ یہ نہ کہو وہی کہو جو پہلے گا رہی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو خاص حکم دیا کہ آپؐ اس حقیقت کو واضح کر دیں ———

قُلْ لَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ ۔ (انعام: ۵)	کہہ دو کہ اے پیغمبر کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔

اور غیب کا علم صرف خدا کی صفت ہے ———

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ (نمل: ۵)	کہہ دے اے پیغمبر کہ خدا کے سوا آسمانوں میں اور زمین میں کوئی غیب نہیں جانتا ———

غیب دانی کے مدعی کاہن جو عرب کی گلی گلی میں خدع و فریب کا جال پھیلائے بیٹھے رہتے تھے اور بت خانوں میں خدائی کرتے تھے، ان کی سطوت خاک میں مل گئی۔ بت خانے ویران ہو گئے تو ان کے پجاری بھی فنا ہو گئے، صحابہؓ نے آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ! ہم جاہلیت میں کاہنوں کے پاس جایا کرتے تھے، فرمایا "اب نہ جایا کرو" عرض کی ہم پرندوں سے فال لیا کرتے تھے، فرمایا، یہ تمہارا وہم تھا، اس کے سبب سے اپنے ارادہ سے باز نہ آیا کرو، بعض لوگوں کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ کاہنوں نہیں انھوں نے کہا یا رسول اللہ! ان کی بعض باتیں سچی بھی نکل آتی ہیں۔ فرمایا شیطان ایک آدھ بات

سُن لیتا ہے اور مُرغی کی طرح قُرقُر کر کے اپنے دوست کے کانوں میں ڈالتا ہے اور وہ اس میں سو باتیں جھوٹ ملا دیتا ہے ——

جاہلوں میں کچھ ایسے مکّار ہوتے ہیں جو چوری کا غائبانہ پتہ بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں عرب ان کو عرّاف کہتے تھے، آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جو کوئی کسی مال کا پتہ پوچھنے کے لئے کسی اعراف کے پاس جائے گا اس کی چالیس دن کی نماز قبول نہ ہوگی علم نجوم جس کے زور سے لوگ غیب کا حال دریافت کر لینے کے مدعی بنتے ہیں، آپؐ نے ان کا سیکھنا بھی جادو کی طرح گناہ بتایا ہے اور فرمایا کہ جو کسی کاہن کے پاس جا کر اسکی باتوں کو سچ سمجھے وہ **محمدؐ** پر جو کچھ اُترا ہے اس سے انکار کرتا ہے ——

ان تعلیمات نے خدا کے علاوہ دوسروں کی غیب دانی کے عقیدہ کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ کر دیا —— کہانت کی گرم بازاری سرد ہو گئی۔ فال، شگونِ بد، نجوم اور غیب دانی کے دوسرے خدّاعانہ طریقے مِٹ گئے، پرندے اور پانسوں کے ذریعہ سے غیب کا حال دریافت کرنا وہم و وسوسہ قرار پایا اور غیب کی مملکت پر خدا کے سوا کسی اور کی حکومت قائم نہ رہی ——

مخفی قوّتوں کا ابطال

(۹) کائنات میں خدا کے سوا جن غیبی اسباب وعلل یعنی سحر و طلسم، جنّات وشیاطین اور ارواحِ خبیثہ اور دوسری قسم کی قوّتوں کی غیبی قدرت و تصرّف کا اعتقاد تھا اور ان سے بچنے کے لئے ان کی دہائی پکاری جاتی تھی، نذر چڑھائی جاتی تھی قربانی کی جاتی تھی، آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم اور وحی نے ان تمام خرافات کا قلع قمع کر دیا، اور خدا کے سوا تمام دوسری مخفی اور پوشیدہ قوّتوں کا ڈر انسان کے سینوں سے ہمیشہ کے لئے نکال کر پھینک دیا، اور دُعا و کلماتِ الٰہی کے سوا ہر نوع کی جھاڑ پھونک، منتر، تعویذ، گنڈے ٹوٹکے جن میں کسی غیر خدا سے غیبی استمداد یا شرک کا کلمہ ہو کُفر قرار پائے۔ اسی قسم کے فاسد

خیالات کے استیصال کیلئے ہر نماز میں اور ہر نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ضمن میں اس آیت کے پڑھنے کا حکم دیا گیا ــــ

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ط ــــ (فاتحہ) ــــ	(اے عالم کے پروردگار) ہم تیرے ہی آگے سر جھکاتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں ــــ

سحر و طلسم و جادو اور ٹوٹکے کے متعلّق ارشادِ خداوندی ہُوا ــــ

وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ------ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ط (البقرہ ۱۴۰)	یہ جادو اور ٹوٹکے کرنیوالے کسی کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے لیکن خدا کے حکم سے اور یہ یہود وہ (جادو اور ٹوٹکے) سیکھتے ہیں جو ان کو نقصان رساں ہیں نفع بخش نہیں اور یقیناً ان کو علم ہے جو ان کو حاصل کرتا ہے اس کا آخرت میں کوئی حصّہ نہیں ہے۔

یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ سحر و جادو کی حقیقت وہم و تخیّل سے زیادہ نہیں۔ فرمایا:۔

يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ــــ (طٰہٰ : ۳) ــــ	مصری جادوگروں کے جادو سے یہ اُس کو خیال ہوتا تھا کہ وہ دوڑ رہے ہیں ــــ

بلکہ بعض صحابہؓ نے ان مکّار جادوگروں کے قلع قمع کے لئے ان کے قتل کا حکم دے دیا[ل۵] تاکہ انسانوں کے دلوں میں ان کا جو خوف و ہراس بیٹھا ہُوا ہے وہ دُور ہو، ان کے اس عاجزانہ قتل ہونے سے یہ ثابت ہو کہ ان میں کوئی غیر معمولی طاقت نہیں وہ بالکل بے بس ہیں۔

ل۵ جامع ترمذی باب ما جاء فی حد الساحر و ابوداؤد و باب اخذ الجزیہ من المجوس۔

ایک اور صحابیؓ روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:—

ان الرقی والتمائم والتولۃ شرک۔ (ابوداؤد وابن ماجہ)	بے شک جھاڑ پھونک، گنڈے اور میاں بیوی کے چھڑانے کے تعویذ شرک ہیں —

ان ہی صحابی کے گھر میں ایک بڑھیا آیا کرتی تھی، گھر والوں نے اس سے کسی بیماری کا کوئی ٹوٹکا کرایا، ایک دھاگہ پڑھ کر اس نے باندھ دیا تھا۔ وہ گھر آئے تو اس دھاگے پر ان کی نظر پڑی، انہوں نے ہاتھ بڑھایا اور اس کو توڑ کر پھینک دیا، پھر فرمایا عبداللہ کا خاندان شرک کی باتوں سے مستغنی ہے۔ میں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو یہ کہتے سُنا ہے کہ جھاڑ پھونک گنڈے اور میاں بیوی کے چھڑانے کے تعویذ شرک ہیں۔ ان کی بیوی نے کہا کیا وجہ ہے کہ ایک دفعہ میری آنکھوں میں کچھ پڑ گیا جب میں جھاڑتی تھی تو پانی رُک جاتا تھا اور جب چھوڑ دیتی تھی تو پانی بھر آتا تھا۔ انہوں نے جواب دیا یہ شیطانی بات ہے تم نے کیوں نہ وہ کام کیا جو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کرتے تھے۔ یہ دُعا پڑھتیں: "اے لوگوں کے پروردگار! اس بیماری کو دُور کر، تو ہی شفا دینے والا ہے، تیری شفا بخشی کے سوا کوئی شفا نہیں، ایسی شفا دے کہ پھر کوئی بیماری نہ ہو"—

اوہام وخرافات کا ابطال

(۱۰) وہ تمام اوہام وخرافات جن سے مشرک اہلِ عرب لرزہ بہ اندام رہتے تھے اور جن کو وہ بالذات مؤثر اور متصرف سمجھتے تھے، آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان کا طلسم توڑ دیا اور اعلان فرمایا کہ ان کی کوئی اصل نہیں، فرمایا:—

لاعدوی ولاطیرۃ ولا صفر ولا ھامۃ۔ (ابوداؤد وابن ماجہ)	نہ چھوت ہے نہ بدفالی ہے نہ پیٹ میں بھوک کا سانپ ہے نہ مُردہ کی کھوپڑی سے پرندہ نکلتا ہے

ایک اور صحابیؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا :—

العیافۃ والطیرۃ والطیرۃ والطرق من الجبت ۔ (ابو داؤد و ابن ماجہ)	پرندوں کی بولی سے فال لینا، ان کے اڑنے سے فال لینا اور کنکری پھینک کر یا خط کھینچ کر حال بتانا شیطانی کام ہیں —

ایک اور صحابی آپؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ فال نکالنا شرک ہے، پھر ان صحابی نے کہا کہ ہم صحابہ میں کوئی نہیں جو اس کو بُرا نہ سمجھتا ہو بلکہ خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیئے یہ بھی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "نچھتر" (نو) کچھ نہیں یعنی پانی کی بارش میں اس کو بالذات کوئی دخل نہیں، اسی طرح غول بیابانی کے متعلّق عربوں کے جو معتقدات تھے ان کو آپؐ نے ایک لفظ سے باطل فرما دیا۔ فرمایا —

لا غول (ابو داؤد باب فی الطیرۃ) غول بیابانی کچھ نہیں —

بحیرہ اور سائبہ وغیرہ جانوروں کے متعلّق ان کے خیالات فاسدہ کا قرآن نے ابطال کیا اور سورۂ انعام میں ان کے مشرکانہ عقائد اور اعمال کی بتصریح تردید کی گئی۔

اور سورۂ مائدہ میں فرمایا گیا —

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۔ (مائدہ : ۴)	خدا نے بحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ عام نہیں ٹھہرایا —

بحیرہ — اس بچّہ کو کہتے تھے جس کا کان پھاڑ کر بتوں کی نذر کرتے تھے —

سائبہ — اس جانور کو کہتے تھے جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا —

وصیلہ — بعض لوگ نذر مانتے تھے کہ اگر بچّہ نر ہوا تو اس کو بت پر چڑھائیں گے اور اگر مادّہ ہوا تو اپنے پاس رکھیں گے۔ پھر اگر نر و مادّہ پیدا ہوتے تو مادہ کے ساتھ

نر بھی رکھ لیتے تھے، یہ وصیلہ تھا ——

حام —— وہ اُونٹ جس کے دس بچّے بوجھ اُٹھانے اور سواری کے لائق ہو چلتے تو دیوتا کے نام پر آزاد کر دیا جاتا تھا ——

یہ اور اسی قسم کے دوسرے اوہام جو عرب میں پھیلے ہوئے تھے، آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان کا استیصال فرمایا، یہ اوہام پرستی حقیقت میں قوموں کی تباہی کا ایک بڑا سبب ہوتی ہے۔ یہ اوہام حقیقت کے خلاف ہونے کے علاوہ بہت سے کاموں میں خلل انداز ہوتے ہیں اور غور سے دیکھو تو ان کا سلسلہ بالآخر کسی نہ کسی شرک پر منتج ہوتا ہے اور انسان کو صحیح طریق عمل سے روک دیتے ہیں، لیکن بیماری میں طب کے قاعدہ کے موافق علاج کیا جائے تو مفید ہوگا لیکن بہت سے لوگ وہم پرستی کی بنا پر ٹونے ٹوٹکے کو دافع مرض سمجھتے ہیں۔ اس قسم کے اوہام عرب میں نہایت کثرت سے پھیلے ہوئے تھے، آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان سب کو تصریح اور تعیین کے ساتھ باطل قرار دیا، مثلاً:——

۱ —— عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا ہے تو چاند اور سورج میں گہن لگتا ہے، آپ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیمؑ کا جب انتقال ہُوا تو سورج گرہن لگا ہُوا تھا، لوگوں نے خیال کیا کہ ان ہی کے مرنے کا اثر ہے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے سُنا تو مسجد میں جا کر خطبہ دیا کہ چاند اور سُورج خدا کی قدرت کی نشانی ہے کسی کے مرنے سے ان میں گرہن نہیں لگتا ——

۲ —— یہ خیال تھا کہ سانپ اگر مارا جائے تو اس کا جوڑا آتا ہے اور انسان کو ہلاک کرتا ہے ——

۳ —— ایک دفعہ آپ مسجد میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک ستارہ ٹُوٹا، آپ نے دریافت فرمایا کہ جاہلیت میں تم لوگ اس کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے تھے، لوگوں نے

عرض کی کہ ہمارا اعتقاد تھا کہ جب کوئی بڑا مرجاتا ہے یا کوئی بڑا شخص پیدا ہوتا ہے تو ستارے ٹوٹتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ کسی کے مرنے یا پیدا ہونے سے ستارے نہیں ٹوٹتے ——

۴ — شیر خوار بچوں کے سرہانے اُسترا رکھ دیا کرتے تھے کہ ان کو جنات نہ ستانے پائیں، ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے دیکھا تو اٹھا کر پھینک دیا اور کہا کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم ان باتوں کو ناپسند کرتے تھے ——

۵ — نظر بد سے بچنے کے لئے اُونٹوں کے گلے میں قلادہ لٹکاتے تھے، آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حکم دیا کہ کسی اُونٹ کے گلے میں قلادہ نہ رہنے پائے ——

الغرض توحیدِ کامل کی تعلیم نے عربوں کے تمام مشرکانہ اوہام وخرافات کو ہمیشہ کیلئے مٹادیا، اسلام کی اِس اصلاحِ اہمیّت کا اندازہ عیسائیت کی ان مقدّس روایات وحکایات سے کرو جنہوں نے صدیوں تک دُنیا کو دیوؤں، بھوتوں اور چڑیلوں کے تسلّط اور عذاب کے شکنجہ میں مُبتلا رکھا اور ان کو نکالنا اور بھگانا عیسائیت کا کمال اور اعجاز سمجھا جاتا رہا۔

کفّارہ اور شفاعت کے غلط معنی کی تردید

(۱۱) شرک کے اسباب میں ایک بڑا سبب کفّارہ اور شفاعت کے وہ غلط معنی تھے جو عربوں اور عیسائیوں وغیرہ میں رائج تھے، عربوں نے شفاعت کے جو غلط معنی سمجھ رکھے تھے اس کا اصلی سبب ان کا وہ تخیّل تھا جو خدا اور بندوں کے تعلّق کی نسبت ان کے ذہن میں قائم تھا، وہ خدا اور بندوں کے درمیان وہی نسبت سمجھتے تھے جو ایک قاہر وجابر بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان ہے اور جس طرح بادشاہ کے دربار تک ایک عام اور معمولی رعایا کی رسائی دربارِس سفارشیوں اور مقرّبوں کے بغیر ممکن نہیں اسی طرح اس شہنشاہ کے دربار میں بھی وہ اس کے دربارِس سفارشیوں اور مقرّبوں کے بغیر رسائی ممکن نہیں سمجھتے تھے، اسی لئے وہ ان درمیانی ہستیوں کے خوش رکھنے کی ضرورت

کے بھی معتقد تھے، چنانچہ وہ اپنے بُتوں، دیوتاؤں اور فرشتوں کو اِسی نیت سے پُوجتے تھے اور کہتے تھے :—

هٰؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (یونس : ۲)	یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں —

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جب ان کی اس بُت پرستی پر ان کو ملامت کی تو اُنہوں نے صاف کہا :—

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (زمر : ۱)	ہم ان کو اسی لئے پُوجتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کے تقرّب میں نزدیک کر دیں۔

یہودیوں میں بھی اسی قسم کی دوسری غلط فہمی تھی وہ یہ سمجھتے تھے کہ بنی اسرائیل کا گھرانا خدا کا خاص کُنبہ اور خاندان ہے اور ان کے خاندان کے پیغمبر اور نبی چونکہ خدا کے پیارے اور محبوّب ہیں اس لئے ان کی اَولاد اور نسل بھی دُنیا اور آخرت میں یہی درجہ رکھتی ہے اگر ان پر کوئی مصیبت بھی پڑے گی تو بھی ان کے خاندان کے بزرگ جو خدا کے مقرّب اور برگزیدہ ہیں، وہ ہر طرح ان کو اس سے بچالیں گے، ان کا دعویٰ یہ تھا کہ :—

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ : ۳)	ہم خدا کی اَولاد اور اس کے پیارے ہیں —

قرآن نے کہا :—

بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ (مائدہ : ۳)	بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہو، یہ اسی کو اختیار ہے جس کو چاہے بخشے اور جس کو چاہے سزا دے —

اور اسی بنا پر ان کا دعویٰ تھا —

لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ	ہم کو دوزخ صرف چند گنتی کے دن چھو کر چھوڑ دے گی ـــــ

قرآن نے کہا :ـــــ

وَغَرَّھُمْ فِیْ دِیْنِھِمْ مَّا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ (آل عمران) ـــــ (آل عمران)	اور یہ اپنے دل سے بنا کر جو جھوٹ عقیدہ گھڑ چکے ہیں وہ ان کے مذہب کے بارہ میں ان کو دھوکا دے رہے۔

عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا اور ہے کہ باپ (خدا) نے تمام انسانوں کی طرف سے جو موروثی اور طبعی طور سے گنہگار ہیں اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت عیسیٰؑ کو قربانی دے کر ان کے گناہوں کا کفّارہ دے دیا، اور وہ گناہوں سے پاک وصاف ہوگئے اور حضرت عیسیٰؑ اور ان کے بعد ان کے جانشین پوپوں کو گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جو زمین پر کھولیں گے وہ آسمان پر کھولا جائے گا۔ اسی لئے پوپوں کے سامنے اعترافِ گناہ کا عقیدہ عیسائیوں میں پیدا ہوا اور اُن کو بندوں کے گناہوں کے مُعاف کرنے کا دُنیا میں حق ملا ـــــ پیغامِ محمدیؐ نے ان کو ملزم قرار دیا اور کہا ـــــ

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ ـــ (توبہ) ـــ	انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور راہبوں کو اپنا خُدا بنا رکھا ہے ـــ

اور اصولی طور پر اُس نے یہ بتا دیا کہ :ـ

وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ ـ (آل عمران)	اور خدا کے سوا کون گناہوں کو مُعاف کرسکتا ہے ـ

اُن کا عقیدہ تھا کہ بیٹا قیامت کے دن باپ کے داہنے بازو پر برابر بیٹھ کر عدل وانصاف کرے گا، قرآن پاک نے ایک بڑے مؤثر طرز میں ان کی تردید کی ہے، قیامت

کے دن خدا حضرت عیسیٰ سے پوچھے گا۔

ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (مائدہ : ۱۶)	اے عیسیٰؑ! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا بناؤ۔

وہ کہیں گے بارِ الٰہا! میں نے تو ان سے وہی کہا جو تُو نے کہا تھا۔ میں نے تو ان کو یہ تعلیم نہیں دی تھی۔ میں نے تو ان سے یہی کہا تھا کہ صرف ایک خدا کو پوجو۔ اب

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (مائدہ: ۱۶)	اگر تُو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تُو بخش دے تو سب کچھ کر سکتا ہے کہ تُو غالب اور حکمت والا ہے

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ گناہوں کی مغفرت اور معافی یا گناہوں پر سزا اور عذاب دینا صرف خدا کے ہاتھ میں ہے، کسی دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

بُت پرستوں عرب کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ دیوتا اور ان کے بُت خُدا کی طرف سے دونوں عالم میں مختارِ کُل ہیں وہ یہاں دینے نہ دینے کا اور اس عالم میں بخشنے کا اختیار رکھتے ہیں، اس عقیدہ کا نام ان کے یہاں شفاعت تھا، اور یہ دیوتا ان کے شفیع تھے، قرآن کریم کفّارہ غیر خُدا کے اختیار مغفرت اور بُت پرستانہ طریقہ، شفاعت کے عقائد باطلہ کی ہر طرح تردید کی اور بتایا کہ یہ اختیار خدا کے سوا کسی اور کو نہیں، سب اس کی عظمت اور جلال کے سامنے عاجز اور درماندہ ہیں۔

وَلَا یَمْلِكُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ۔ (زخرف : ۷)	یہ کافر خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جس نے حق کی شہادت دی اور وہ جانتے بھی ہوں۔

لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ــــ (مریم: ٦)

یہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جس نے رحم والے خدا سے اقرار لے لیا ــــ

ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ــــ (یٰس: ٢)

کیا خدا برحق کو چھوڑ کر جھوٹے معبودوں کو خدا بناؤں، اگر رحمٰن مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی شفاعت مجھے ذرا بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکتے ہیں

کفار فرشتوں کو بھی اسی غرض سے پوجتے تھے، حکم ہوا۔

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى (النجم: ٢)

اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت کچھ فائدہ نہیں پہنچاتی لیکن اس کے بعد کہ اللہ اجازت دے جس کے لئے چاہے اور پسند کرے ــــ

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ۭ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ (زمر: ٥)

کیا ان کافروں نے خدا کے سوا کوئی شفیع بنایا ہے، کہہ دے کہ اگر یہ کچھ اختیار اور سمجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں تو بھی؟ شفیع بننے کے قابل ہیں۔

خدا قیامت میں ان سے کہے گا ــــ

وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَ

اور تم دیکھتے نہیں، تمہارے ساتھ

كُمُ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكٰؤُا (انعام: ۱۱)	تمہارے ان شفیعوں کو جن کو تم سمجھتے تھے کہ وہ تمہاری ملکیت میں خدا کے ساتھ شریک ہیں۔
وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ وَلَمْ يَكُن لَّهُم مِّن شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰؤُا۔ (روم: ۲)	اور جب قیامت قائم ہو گی تو مشرکین نا اُمید ہوں گے کہ جن کو وہ خدا کا شریکِ کار بتاتے تھے ان میں کوئی ان کا شفیع نہ ہوا۔

خاص یہود کو مخاطب کر کے ان کے عقیدہ کی تردید میں کہا گیا ——

يٰبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ... وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (بقرہ: ۶)	اے فرزندانِ اسرائیل! اور ڈرو اس دن سے جس میں کوئی کسی کے ذرا بھی کام نہ آئے گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی بدلہ قبول ہو گا اور نہ شفاعت فائدہ دے گی ——

اور اسی معنی میں مسلمانوں سے بھی کہا گیا کہ وہ عمل پیش کریں، شفاعت کے بھروسے پر نہ رہیں —— ارشادِ خداوندی ہے :——

يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنٰكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ (بقرہ: ۳۴)	اے مسلمانو! جو کچھ ہم نے تم کو روزی دے رکھی ہے اس میں سے کچھ خرچ کر دیا کرو اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ لین دین ہے نہ دوستی ہے نہ شفاعت ہے ——

غرض آپؐ کے پیغام نے ان معنوں میں شفاعت کے عقیدہ باطل کی ہر جگہ تردید کی ہے

اور اعلان یہ ہے کہ اس شفاعت کا اختیار صرف خدا کے ہاتھ میں ہے ـــــ

اَمِ اتَّخَذُوا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ کَانُوْا لَا یَمْلِکُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَعْقِلُوْنَ ؕ قُلْ لِّلّٰہِ الشَّفَاعَۃُ جَمِیْعًا ؕ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ (زمر : ۵)	کیا انہوں نے خدا کے سوا اوروں کو شفیع بنا رکھا ہے ۔ کہہ دے کہ اگرچہ ان کو کسی چیز کا کُل چیز کا اختیار نہ ہو اور نہ ان کو سمجھ ہو، تو یہ بھی کہہ دے کہ شفاعت کا کُل اختیار خدا ہی کو ہے اسی کا راج آسمانوں اور زمین میں ہے

پھر اسی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ـــــ

اس آیت پاک نے کفّار مشرکین کے عقیدۂ شفاعت کی قطعی طور سے تردید کی، دوسری آیت میں عقیدۂ شفاعت کا صرف اتنا حصّہ تسلیم کیا کہ خدا کے نیک بندے اپنے بھائیوں کے حق میں شفاعت کریں گے ـــــ

وَلَا یَمْلِکُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہِ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَنْ شَہِدَ بِالْحَقِّ وَھُوْ یَعْلَمُوْنَ ( )	اور یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جنہوں نے حق کی گواہی دی اور وہ دانش رکھتے ہیں ـــــ

دوسری جگہ اسی شہادت کو اقرار لینا کہا گیا ہے ـــــ

لَا یَمْلِکُوْنَ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَہْدًا ۔ (مریم : ٦)	یہ لوگ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جو خدا کے نزدیک (دنیا میں اپنے عمل کے ذریعہ سے) اقرار لے چکا ہے۔

لیکن اس شہادتِ حق اور عہدِ الٰہی کے باوجود اس اختیار کے استعمال کیلئے اللہ تعالیٰ

کی اجازت اور رضامندی شرط ہے ۔

آیت	ترجمہ
مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ (یونس: ۱)	(خدا کی بارگاہ میں) کوئی شفیع نہیں، اس کی اجازت کے بعد۔
مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ط (بقرہ: ۳۴)	وہ کون ہے جو خدا کے سامنے کسی کی شفاعت کرسکے لیکن اسکی اجازت سے۔
وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى	اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ انکی شفاعت ذرا بھی کام نہیں آسکتی، البتہ اس کے بعد خدا اجازت دے جس کو چاہے اور پسند کرے ۔
لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا۔ (نبا: ۲)	یہ فرشتے اور روح کوئی خدا سے اس دن بات نہ کرسکے گا لیکن جس کو وہ رحم والا اجازت دے اور ٹھیک کہے۔

پھر یہ شفاعت بھی ان ہی لوگوں کے حق میں ہوسکے گی جن کے حق میں اللہ تعالیٰ انبیاء اور صالحین کو اس کی اجازت دے گا، فرمایا:۔

آیت	ترجمہ
وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ (سبا: ۳)	اور شفاعت خدا کے نزدیک نفع نہ دے گی لیکن اس کے لئے جس کیلئے وہ شفاعت کی اجازت دے۔
يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ۔ (طٰہٰ: ٦)	اس دن شفاعت نفع نہ دے گی لیکن اس کو جس کے لئے خدا اجازت دے اور اس کے لئے بات کرنا پسند کرے ۔

بلکہ خود انبیاء علیہم السلام بھی سفارش ان ہی کریں گے جن کی سفارش خود خدا چاہے گا۔

وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ (انبیاء: ۲)	اور وہ شفاعت نہیں کریں گے لیکن اس کی جس کے لئے خدا اپنی خوشنودی ظاہر کرے اور وہ اس کے خوف سے ترساں ہوں گے ــــــــ

پھر ایک جماعت ایسی بھی ہے جس کے افراد کیلئے ازل ہی سے یہ اعلان عام ہو چکا ہے کہ ان کے لئے مغفرت اور شفاعت کا دروازہ بند ہے اور یہ وہ مجرم ہیں جن کے دل حق کی شہادت سے محروم ہو گئے ــــــــ

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ (مدثر ۲) مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ (مومن: ۲)	تو ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت فائدہ نہ دیگی ظالموں (مشرکوں) کا نہ کوئی دوست (اس دن ہوگا) اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے۔

اور وہ بدنصیب گروہ جس کے حق میں رحمت کا یہ دروازہ بند رہے گا مشرکین ہیں جیسا کہ ذیل کی آیت سے ظاہر ہے ــــــــ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ (نساء: ۱۸)	اللہ اس گناہ کو کہ اس کے ساتھ کوئی شریک ٹھہرایا جائے نہیں بخشتا۔ اور اس سے نیچے کے گناہ جس کو چاہے بخش دے ــــــــ

لیکن اب ایسی حالت میں جب کہ وہی شفاعت کر سکیں گے، جن کو اللہ تعالیٰ اس کی اس کی اجازت دے گا اور وہ بھی ان کی شفاعت کریں گے جن کی شفاعت کرانا خود خدا کو منظور ہو گا۔ تو حقیقت میں خود اللہ تعالیٰ ہی اپنے دربار میں اپنا آپ شفیع ہو گا

اسی لئے ارشاد ہوا ——

وَاَنْذِرْ بِہِ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْ یُّحْشَرُوْٓا اِلٰی رَبِّھِمْ لَیْسَ لَھُمْ مِّنْ دُوْنِہٖ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ لَّعَلَّھُمْ یَتَّقُوْنَ	اور اس قرآن کے ذریعہ (اے پیغمبر) ان لوگوں کو ہشیار کردے کہ اس سے ڈرتے رہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جمع کئے جائیں گے ان کیلئے ان کے رب کے سوا کوئی حمایتی اور شفیع نہیں شاید وہ بچتے رہیں ——
مَالَکُمْ مِّنْ دُوْنِہٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا شَفِیْعٍ اَفَلَا تَتَذَکَّرُوْنَ (السجدہ : ۱)	خدا کے سوا تمہارے کوئی حمایتی اور شفیع نہیں، پھر کیا تم سوچتے نہیں.

اجرامِ سماوی کی قدرت کا انکار

بظاہر دنیا میں بہت سی باتیں آفتاب و ماہتاب کی گردش اور ان کے سبب اختلاف موسم کے اثرات سے ہوتی ہیں۔ اس لئے ستارہ پرست قوموں میں یہ اعتقاد پیدا ہوگیا کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ستاروں کی گردش کے اثر سے ہوتا ہے، یہی اعتقاد عرب کے مشرکوں میں بھی پھیلا ہوا تھا وہ سورج اور چاند کو سجدے کرتے تھے، اسلام نے ان کو اس شرک سے روکا اور کہا ——

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ | سورج اور چاند کو سجدے نہ کیا کرو۔

اسی طرح وہ زمانہ کو دنیا کے کاروبار میں حقیقی مؤثر جانتے تھے اور یہ کہتے تھے۔

وَمَا یُھْلِکُنَآ اِلَّا الدَّھْرُ —— ہم کو تو زمانہ مارتا ہے —— (جاثیہ : ۳)

اسی کا اثر ہے کہ ہماری شاعری کی زبان میں "فلک کج رفتار" اور "دہر نا ہنجار" کی شکایت اب تک چلی آتی ہے، عرب کے مشرکین بھی اسی طرح بولا کرتے تھے، ان کو جب کوئی خلافِ توقع تکلیف پہنچتی تھی تو زمانہ کی شکایت کرتے تھے اور اس کو برا کہتے تھے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس سے منع کیا، اور فرمایا کہ زمانہ کو گالی نہ دیا کرو کہ زمانہ خود خُدا کا ہے۔ اور فرمایا کہ خدا ارشاد فرماتا ہے کہ آدم کا بیٹا مجھے تکلیف پہنچاتا ہے وہ زمانہ کو بُرا کہتا ہے، زمانہ کا مالک میں ہوں میرے ہاتھ میں تمام کام ہیں، میں شب و روز کا انقلاب کرتا ہوں، یعنی زمانہ جن کو تکلیفوں اور مصیبتوں کا خالق سمجھ کر لوگ بُرا کہتے ہیں حقیقت میں ان کا پیدا کرنے والا خدا ہی ہے، اسی لئے یہ گالی حقیقت میں خُدا کو دی جاتی ہے ——

اسی خیال کا یہ بھی اثر تھا کہ اھل عرب بارش کو نچھتر کیطرف منسوب کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ فلاں نچھتر کے سبب سے ہم پر پانی برسایا گیا۔ حدیبیہ کے موقع پر اتّفاق سے رات کو بارش ہوئی، صبح کو نماز کے بعد آپ صحابہؓ کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا: جانتے ہو تمہارے ربّ نے کیا کہا۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ خدا اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے ارشاد ہُوا، اُس نے فرمایا آج صبح کو میرے بندوں میں سے کُچھ مؤمن ہو کر اُٹھے اور کُچھ کافر ہو کر جنھوں نے یہ کہا کہ خدا کے فضل و کرم سے ہم پر پانی برسا وہ تو خدا پر ایمان لانے والے اور ستارہ کے انکار کرنے والے ہیں —— اور جنھوں نے یہ کہا کہ فلاں نچھتر سے پانی ہم پر برسا تو وہ خُدا کے انکار کرنے والے اور ستارہ پر ایمان لانے والے ہیں ——

غیر خُدا کی قسم سے روکنا

(۱۳) شرک کی ایک نہایت باریک صورت یہ تھی کہ لوگ غیر خدا کی قسمیں کھاتے تھے۔ قسم کھانے کے معنی حقیقت میں شہادت کے ہیں، جس کی قسم کھائی جاتی ہے اس کو در اصل واقعہ پر گواہ بنایا جاتا ہے۔ عربوں میں بُت پرستی کے رواج کے باعث بُتوں اور دیوتاؤں کی قسمیں کھائی جاتی تھیں جو صریح کُفر تھا، قُریش اپنے دیوتا لات وعزّیٰ کی قسمیں کھایا کرتے تھے، آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس سے منع فرمایا لیکن رواج اور عادات کے باعث مسلمان ہونے کے بعد بھی بے اختیار ان کی زبان سے ان کی قسمیں نکل جاتی تھیں، آپ نے فرمایا جس شخص کی زبان سے لات اور عزّیٰ کی قسم نکل جائے تو وہ فوراً لا الٰہ الّا اللہ کہہ (لے) یہ گویا اس کُفر کے کلمہ

سے توبہ ہے، قریش میں باپ کی قسم کھانے کا بھی رواج تھا، اس سے بھی آپؐ نے منع فرمایا: ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو اپنے باپ کی قسم کھاتے سُنا تو آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اس سے منع کیا ہے کہ اپنے باپ کی قسم کھایا کرو، جس کو قسم کھانی ہو وہ یا تو خدا کی قسم کھائے ورنہ چُپ رہے ——— حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کے ارشاد کا یہ اثر ہُوا کہ اس وقت سے آج تک میں نے تو اپنی بات میں اور نہ کسی اور کی بات دُہرانے میں کبھی باپ کی قسم کھائی۔ ماں کی قسم بھی لوگ کھایا کرتے تھے، اس سے بھی آپؐ نے منع فرمایا، اسی طرح کعبہ کی بھی قسم لوگ کھایا کرتے تھے اس پر ایک یہودی نے آکر مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ تم بھی شرک کرتے ہو کعبہ کی قسم کھاتے ہو، آپؐ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ کعبہ نہیں بلکہ کعبہ والے (خدا) کی قسم کھایا کرو۔ ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کسی کو کعبہ کی قسم کھاتے سُنا تو اس کو منع کیا اور کہا کہ غیر خدا کی قسم نہ کھائی جائے، میں نے رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم کو یہ کہتے سُنا ہے کہ جس نے غیر خدا کی قسم کھائی اس نے کُفر کیا یا شرک ———

دوسری روایت میں ہے کہ ہر وہ قسم جو غیر خدا کی کھائی جائے شرک ہے ———

خُدا کی مشیت میں کوئی شریک نہیں

(۱۴) اکثر نیک لوگوں کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی مشیّت عین خدا کی مشیّت ہے اس میں نہ صرف بدعقیدہ لوگ بلکہ اہلِ توحید اور صوفیا بھی غلطی سے مُبتلا ہو جاتے ہیں۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے انسانوں کو اس دقیق غلطی سے بھی آگاہ کیا اور بتایا کہ دُنیا میں مشیّت صرف خدا کی ہے، اسی کی خواہش کے مُطابق دُنیا چل رہی ہے، تمام مشیّتیں اور خواہشیں اسی کی مشیّت اور خواہش کے ماتحت ہیں، اس کے ساتھ کسی مخلوق کی مشیّت، عالَم کے کاروبار میں شریک نہیں لیکن لوگوں نے خدا کی مشیت کے ساتھ اَوروں کی مشیّت کو بھی شریک کر لیا تھا۔ توحیدِ کامل کے معلّم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس خیال کی سختی سے تردید کی، اور قرآن مجید نے جا بجا اس حقیقت

کو واضح کیا کہ مشیّت الٰہی کے علاوہ کوئی اور حقیقی مشیّت نہیں، تمام دیگر مشیّتیں اس کے تابع اور ماتحت ہیں، عقیدہ کی یہ غلطی اس قدر عام تھی کہ جو لوگ عقیدۃً نہیں رکھتے تھے وہ بھی سلاطین، حکام اور بزرگوں کے ساتھ گفتگو میں یہ کہنا حُسنِ اَدب سمجھتے تھے کہ جو خدا چاہے اور جو حضورؐ چاہیں ـــــ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس طرزِ کلام سے منع فرمایا، یہاں تک کہ خُدا کی مشیّت کے ساتھ برابری سے خود اپنی مشیّت کے ذکر سے صحابہؓ کو روکا۔ اس قسم کا طرزِ کلام لوگوں کی زبان پر چڑھ گیا تھا، اس میں یہ تصحیح فرمائی کہ خدا اور غیر کی مشیّت کے درمیان عطف کا واؤ (اور) نہ لایا جائے کہ اس سے برابری کا شائبہ نکلے بلکہ پھر کا لفظ بولا جائے تاکہ معلوم ہو کہ خدا کی مشیّت کے بعد اَوروں کی مشیّت کا دَرجہ ہے ـــــ

نسائی میں ہے کہ ایک یہودی نے خدمتِ نبوی میں آکر مسلمانوں سے کہا کہ تم لوگ شرک کرتے ہو، کہتے ہو کہ جو خدا چاہے اور جو محمدؐ چاہیں۔ آپؐ نے صحابہؓ کو مخاطب کرکے فرمایا، یوں کہو کہ وہ ایک ہے جو چاہے، پھر جو آپ چاہیں۔ یہی واقعہ ابنِ ماجہ میں اس طرح ہے کہ ایک صحابیؓ نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک یہودی یا عیسائی ان سے کہہ رہا ہے کہ تم مسلمان بڑے اچھے لوگ ہوتے اگر شرک نہ کیا کرتے، تم کہا کرتے ہو کہ خدا جو چاہے اور محمدؐ چاہیں، ان صحابی نے خدمتِ اقدس میں آکر اپنا یہ خواب بیان کیا، آپؐ نے فرمایا میں اس فقرہ کی بُرائی جانتا تھا۔ یُوں کہو کہ جو خدا چاہے ـــــ پھر جو محمدؐ چاہیں ـــــ

اس سلسلہ میں یہاں تک اہتمام مدّ نظر تھا کہ اس سے بھی منع فرمایا کہ خدا اور رسُول کی طرف ایک ضمیر پھیر کر ایک فعل لایا جائے تاکہ یہ سمجھا جائے کہ خُدا اور رسول کا درجہ برابر برابر ہے۔ ایک دفعہ آپؐ کے سامنے کسی شخص نے خطبہ کے اثنا میں یہ فقرہ کہا، جس نے خدا اور رسُول کی اطاعت کی اس نے ہدایت پائی اور جس نے ان دنوں کی نافرمانی کی۔ یہاں تک اس نے کہا تھا کہ آپؐ نے اس کو روک دیا اور فرمایا "اُٹھ جاؤ! تم بُرے خطیب ہو" آپؐ نے آزردگی کا اظہار اس لئے فرمایا کہ ان دونوں کو ساتھ کہنے سے سامعین پر بُرا اَثر پڑتا ہے کہ خُدا کی اور

رسول کی نافرمانی کا حکم برابر ہے اور اس میں شرک کا شائبہ ہے، اس لئے خطیب کو یوں کہنا چاہیئے تھا کہ اور جو خدا کی اور رسول کی نافرمانی کرے گا وہ .... جیسا کہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے اور ماثورہ خطبوں میں بھی منقول ہے ــــــ

مشتبہات شرک کی ممانعت

(۱۵) جن باتوں میں شرک کا ذرا بھی شائبہ پایا جاتا تھا ان سے بالکل منع کر دیا لوگ اولاد کا نام آفتاب ماہتاب وغیرہ کی عبدیت کے ساتھ رکھتے تھے، مثلاً عبدالشمس، عبد مناف، ان ناموں سے سخت منع فرمایا ارشاد ہوا کہ بہترین نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں، اہل عجم اپنے سلاطین کو شاہنشاہ یعنی تمام بادشاہوں کا بادشاہ کہتے تھے چونکہ اس میں شرک کا احتمال تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ نام خدا کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا اس شخص پر اللہ کا بے حد غضب ہوا جس نے اپنے آپ کو شہنشاہ کہا۔ خدا کے سوا کوئی بادشاہ نہیں۔ (حاکم فی المستدرک ص ۲۷۵، ج ۴)

غلاموں کو لوگ عبد یعنی بندہ کہتے تھے، حالانکہ انسان خدا کا بندہ ہے آدمیوں کا نہیں اسی طرح غلام نے اپنے مالک کو ربّ کہتے تھے، حالانکہ ربّ خدا ہے اس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعاً منع فرمایا کہ کوئی شخص غلاموں کو عبد یعنی بندہ نہ کہنے پائے بلکہ یوں کہے کہ میرا بچہ یا بچی اور اسی طرح غلام اور باندیاں اپنے آقا کو ربّ نہ کہیں، مالک کہیں کہ تم سب غلام ہو اور اللہ ربّ ہے ــــــ

ہانی رضؓ ایک صحابی رضؓ تھے جن کی کنیت ابوالحکم تھی وہ جب خدمت اقدس میں اپنی قوم کے ساتھ آئے تو آپؐ نے فرمایا کہ حکم خدا کا ہے اور خدا ہی حکم دینے والا ہے ــــــ

اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی برا کام کرتے ہیں تو شیطان پر لعنت بھیجتے ہیں، گویا اس نے برائی کرائی ایک دفعہ ایک صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گھوڑے پر سوار تھے، گھوڑے نے ٹھوکر کھائی، انہوں نے کہا شیطان کا برا

ہو۔ آپؐ نے فرمایا، یوں نہ کہو، ورنہ شیطان غرور سے پھول جائے گا اور کہے گا، میری قوّت سے یہ ہوا، خدا کا نام لو، تو شیطان دب کر مکھّی کے برابر ہو جائے گا ــــــ

قبر پرستی اور یادگار پرستی سے روکنا

(۱۶) شرک کا بڑا ذریعہ قبر پرستی اور یادگار پرستی ہے۔ قبروں اور یادگاروں کو لوگ عبادت گاہ بنا لیتے ہیں، سالانہ مجمع کرتے ہیں۔ دُور دُور سے سفر کرکے آتے ہیں۔ قبروں میں مسجدیں بناتے ہیں، منّتیں مانتے ہیں۔ نذریں چڑھاتے ہیں ــــ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان تمام افعال سے منع کیا ہے۔ وفات سے پانچ دن پہلے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ قبروں کو مسجد بنا لیتے تھے، دیکھو میں تم کو منع کرتا ہوں کہ قبروں کو مسجد نہ بنانا ــــ عین وفات کے وقت چہرہ سے چادر اُلٹ دی اور فرمایا کہ خدا یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے ان لوگوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجد بنا لیا ــــ

(سیرت النبیؐ)

عقائد

کی حقیقت اور اہمیت

انسان کے تمام افعال، اعمال اور حرکات کا محور اس کے خیالات ہیں، یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں، یہ عام خیالات اور حقیقت اس کے چند پختہ، غیر متزلزل اور غیر مشکوک اصولی خیالات پر مبنی ہوتے ہیں — ان ہی اصولی خیالات کو عقائد کہتے ہیں، یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اس کے دائرۂ حیات کا ہر خط اسی پر جاکر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے تمام افعال اور حرکات ہمارے ارادہ کے تابع ہیں۔ ہمارے ارادہ کا محرک ہمارے خیالات اور جذبات ہیں اور ہمارے خیالات اور جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں۔ عام بول چال میں ان ہی چیزوں کی تعبیر ہم "دل" کے لفظ سے کرتے ہیں —

قرآن پاک نے (قلب) کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں۔ سب سے پہلے قَلْبٌ سَلِیْمٌ (سلامت دل) جو ہر گناہ سے پاک رہ کر بالطبع نجات اور سلامت روی کے راستہ پر چلتا ہے، دوسرا اس کے مقابل قَلْبٌ اٰثِمٌ (گنہگار دل) یہ ہے جو گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اور تیسرا قَلْبٌ مُّنِیْبٌ (رجوع ہونے والا دل) یہ وہ ہے جو اگر کبھی بھٹکتا اور بے راہ بھی ہوتا ہے تو فوراً نیکی اور حق کی طرف رجوع ہوتا ہے —

غرض ـــــ ہمارے تمام اعمال کا محرّک، ہمارے اسی دِل کا ارادہ اور نیّت ہے آج کل علمِ نفسیات نے بھی اس مسئلہ کو بداہتہً ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لئے اس کی قلبی اور دماغی اصلاح مقدّم ہے اور انسان کے دل اور ارادہ پر اگر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے اب صحیح اور صالح عمل کے لئے ضروری یہ ہے کہ چند صحیح اصول و مقدّمات کا ہم اس طرح تصوّر کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بن جائیں اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدہ کے تحت میں ہم اپنے تمام کام انجام دیں ـــــ جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصولِ موضوعہ اور اصولِ متعارفہ کے مانے بغیر نہ بن سکتی ہے نہ ثابت ہو سکتی ہے، اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح و درست نہیں ہو سکتا جب تک اس کے لئے بھی چند اصولِ موضوعہ ہم پہلے نہ تسلیم کر لیں ـــــ

بظاہر عقل ہمارے ہر کام کے لئے ہم کو رہنما نظر آتی ہے لیکن غور سے دیکھو کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں، وہ ہمارے دلی یقین، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اس لئے اس پابہ زنجیر عقل کے ذریعہ ہم اپنے دلی خیالات، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات پر قابو نہیں پا سکتے، اگر پا سکتے ہیں تو اپنے صحیح دلی یقینات اور چند مضبوط دماغی و ذہنی تصوّرات کے ذریعہ، یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے ایمان کا ذکر ہمیشہ "عملِ صالح" کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں سمجھا ہے کہ ایمان کے عدم سے دِل کے ارادہ اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادہ کا بھی عدم ہو جاتا ہے ـــــ

قرآنِ پاک نے ان لوگوں کے کارناموں کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں۔ اس راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اُڑا اُڑا کر فنا کر دیتے ہیں اور ان کا کوئی وجود نہیں رہتا، اسی طرح اس شخص کے کام جو ایمان سے محروم ہیں بے بنیاد اور بے اصل ہیں۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّھِمْ اَعْمَالُھُمْ کَرَمَادِ نِ اشْتَدَّتْ بِہِ الرِّیْحُ فِیْ یَوْمٍ عَاصِفٍ ط لَا یَقْدِرُوْنَ مِمَّا کَسَبُوْا عَلٰی شَیْءٍ ط ذٰلِکَ ھُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ - (ابراہیم ۳)	جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا ان کے کاموں کی مثال راکھ کی ہے جس پر آندھی والے دن زور سے ہوا چلی وہ اپنے کاموں سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے، یہی سب سے بڑی گمراہی ہے ـــــ

سورۂ نور میں ایمان کی دولت سے محروم لوگوں کے اعمال کی مثال سراب سے دی گئی ہے کہ اس کے وجود کی حقیقت فریب نظر سے زیادہ نہیں ـــــ

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَعْمَالُھُمْ کَسَرَابٍ بِقِیْعَۃٍ یَّحْسَبُہُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ط حَتّٰی اِذَا جَآءَہٗ لَمْ یَجِدْہُ شَیْئًا - (سورۂ نور ۵)	اور جنہوں نے خدا کا انکار کیا ان کے کام اس سراب کی طرح ہیں جو میدان میں ہو، جس کو پیاسا پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو وہاں کسی چیز کا وجود اس کو نظر نہ آئے ـــــ

دورِ جدید میں

قرآنی دعوت

مُسلمانوں کے اُوپر اللہ تعالیٰ نے مختلف فریضے عائد کئے ہیں۔ اپنے آپ کو خدا کا عبادت گزار بنانے سے لے کر مسلمانوں کی اصلاح تک بہت سی ذمہ داریاں ہیں جن میں مسلمان بندھے ہوئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک ذمہ داری وہ ہے جس کو اسلامی دعوت یا دعوت اِلی اللہ کہا جاتا ہے۔ اس کا مقصد غیر مسلم اقوام تک خدا کے سچّے دین کا پیغام پہنچانا ہے۔ یہ مسلمانوں کی قومی جدوجہد کا عنوان نہیں بلکہ پیغمبرؐ کی وراثت ہے جو ختم نبوت کے بعد مسلمانوں کے حصّہ میں آئی ہے ————

اس سلسلہ میں پہلی بات جس کو جاننا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ وہ کون سے حالات ہیں جن کے درمیان ہم کو دعوتِ حق کا کام انجام دینا ہے۔ مختصر لفظوں میں اس کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے اسلاف کے لئے دعوت اِلی اللہ کا مطلب دَورِ شرک کو ختم کرنا تھا، اب ہمارے لئے دعوتِ الی اللہ کا مطلب دَورِ الحاد کو ختم کرنا ہے۔ ہمارے اسلاف دَورِ شرک کو ختم کر کے دَورِ توحید لے آئے۔ اس کے بعد دُنیا میں ایک نئی تاریخ

؎ مقدمہ اور مضمون ھذا کو وحید الدین خان کے مقالات سے مقبس کیا گیا ہے۔

وجود میں آئی ۔ یہ تاریخ ہزار سال تک کامیابی کے ساتھ چلتی رہی ۔ یہاں تک کہ سولھویں صدی عیسوی میں مغربی سائنس کا ظہور ہوا ۔ اس کے بعد دُنیا کی ایک نئی تاریخ بننا شروع ہوئی ۔ بیسویں صدی میں آکر یہ تاریخ اپنے کمال پر پہنچ گئی ۔ اَب دوبارہ یہ حال ہو گیا ہے کہ ظہورِ اسلام سے پہلے جس طرح فکر و عمل کے تمام شعبوں پر شرک کا غلبہ تھا ، اسی طرح اب فکر و عمل کے تمام شعبوں پر الحاد کا غلبہ ہو چکا ہے حتیٰ کہ آج مذہب بھی علمی طور پر الحاد کا ضمیمہ بن چکا ہے ۔ اس سے الگ اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ——

ان حالات میں دعوتِ توحید کا کام گویا خدا کو ازسرِ نو فکرِ انسانی کے نقشہ پر لکھنا ہے عالمی سطح پر ایک ایسا فکری انقلاب لانا ہے کہ انسان دوبارہ خدائی اصطلاحوں میں سوچنے کے قابل ہو سکے اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ توحید اور آخرت کی بات آدمی کی سمجھ میں آئے اور اس کو وہ حقیقت سمجھ کر قبول کر سکے ۔ ہمارے اسلاف نے انسانی فکر کی دُنیا میں شاکلۂ شرک کو توڑ کر شاکلۂ توحید کو قائم کیا تھا ۔ اَب ہم کو دوبارہ شاکلۂ الحاد کو توڑ کر شاکلۂ توحید پر انسانی فکر کا نظام قائم کرنا ہے ۔ دعوت کے مسئلہ کا اس سے کم تصوّر دعوت کے مسئلہ کی تصغیر ہے جس کی کوئی قیمت نہ بندوں کے نزدیک ہے اور نہ خدا کے نزدیک ۔

لٹریچر کی تیّاری

قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوا ہے کہ خدا نے قلم کے ذریعے انسان کو تعلیم دی (علّمَ بالقلم) اس سے اسلامی دعوت کے لٹریچر کی اہمیّت معلوم ہوتی ہے ——

مگر اسلامی لٹریچر کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام کے نام پر کچھ کتابیں لکھی جائیں اور ان کو کسی نہ کسی طرح مختلف زبانوں میں چھاپ کر تقسیم کر دیا جائے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی لٹریچر کا معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہیں ۔ یہ بشری سطح پر قرآن کی تعلیم فراہم کرنا ہے ——

خدا نے اپنا کلام عربی زبان میں اُتارا ہے مگر اس کی تبلیغ دُوسری زبان والوں تک

بھی کرنی ہے اور جیسا کہ ثابت ہے، مدعوی اپنی زبان میں کرنی ہے۔ اس لحاظ سے اگر علّم بالقلم کو وقتی نہ سمجھا جائے بلکہ اس کو ابدی پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو یقینی طور پر انسان اس میں شامل ہو جاتا ہے کیونکہ دوسری زبانوں میں تعلیم بالقلم کا فریضہ انسان ہی کو ادا کرنا ہے —— خدا کے دین کی دعوت اتمام حجّت کی حد تک مطلوب ہے (النساء ۱۶۵) اسی اتمام حجّت کے لئے قدیم زمانہ میں پیغمبروں کے ذریعہ معجزے دکھائے گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ آج کی قوموں کے لئے بھی یہی مطلوب ہے کہ دین کی دعوت ان کے سامنے اتمام حجّت کی حد تک پیش کی جائے، پھر موجودہ زمانہ میں اس کا ذریعہ کیا ہے جب کہ پیغمبروں کی آمد اب ختم ہو چکی ہے ——

جدید سائنسی انقلاب اسی سوال کا جواب ہے۔ جدید سائنسی انقلاب کے ذریعہ یہ ممکن ہو گیا ہے کہ دینِ حق کی تعلیمات کو عین اس معیار پر ثابت کیا جا سکے جو انسان کا ایک تسلیم شدہ معیار ہے۔ اس سلسلے میں پہلی اہم ترین بات وہ ہے جو طریق استدلال سے تعلّق رکھتی ہے۔ جدید سائنس نے مختلف میدانوں میں اپنی تحقیقاتی نتیجہ میں اس بات کا قطعی اقرار کیا ہے کہ استنباطی استدلال اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنا ہی معقول ہے جتنا کہ براہِ راست استدلال۔ یہی قرآن کا طرزِ استدلال ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں علم انسانی نے قرآن کے طرزِ استدلال کو عین وہی درجہ دے دیا ہے جو علوم دینیہ سے باہر خود انسان کا تسلیم شدہ طرزِ استدلال ہے ——

جدید سائنس کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ جو پہلے صرف خارجی اطلاع کی حیثیت رکھتی تھی وہ اب خود انسانی دریافت بن چکی ہے۔ جدید سائنس نے معلوم کیا ہے کہ انسان اپنی محدودیت کی وجہ سے کُلی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانی رہنمائی کے لئے وحی کی ضرورت ہے۔ جدید سائنس نے معلوم کیا ہے کہ کائنات میں تحکمی نظام ہے۔ اس سے واضح طور پر خدا کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ جدید سائنس نے معلوم کیا ہے کہ موجودہ

دُنیا کے ساتھ ایک اور غیر مرئی متوازی دُنیا موجود ہے جس کا سائنسی نام اینٹی ورلڈ ہے۔ اس سے واضح طور پر عالمِ آخرت کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ وغیرہ ———

اسی طرح مقناطیسی میدان اور حرکت کی یکجائی سے بجلی کی روشنی کا پیدا ہونا ویسا ہی ایک حیرت ناک خدائی معجزہ ہے۔ جیسا ہاتھ کو بغل میں رکھ کر نکالنے سے ہاتھ کا غیر معمولی طور پر چمکنا۔ بڑے بڑے جہازوں کا اتھاہ سمندروں اور ناقابلِ عبور فضاؤں میں انسان کو لے کر دوڑنا ویسا ہی دہشت خیز خدائی معجزہ ہے جیسا دریا کا پھٹ کر انسانوں کو پار ہونے کا راستہ دینا۔ مادہ سے متحرک مشینوں کا وجود میں آنا ویسا ہی عجیب خدائی معجزہ ہے جیسا لاٹھی کا سانپ بن کر چلنے لگنا ———

واقعہ یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں پیغمبروں کو جو معجزے دیئے گئے وہ سب باعتبار مواد خُدا کی پیدا کی ہوئی کائنات میں وسیع پیمانہ پر موجود ہیں۔ مگر قدیم زمانے میں چوں کہ وہ انسان کے علم میں نہیں آئے تھے اس لئے آج کے انسان کے یقین وایمان کے لئے وہی کافی ہیں

حقیقت یہ ہے کہ سائنسی انقلاب خدا کے معجزہ کا ظہور ہے۔ اس کے ذریعہ خدا تعالیٰ کی تمام اعجازی سطح پر ثابت ہو رہی ہیں۔ اگر ان سے گہری واقفیت حاصل کی جائیں اور ان کو دعوتِ حق کی حمایت میں استعمال کیا جائے تو یہ دعوت کے ساتھ معجزہ کو جمع کرنے کے ہم معنی ہوگا ———

سائنسی استدلال موجودہ زمانہ میں معجزاتی استدلال کا بدل ہے۔ جدید سائنس نے تمام دینی تعلیمات کو علمی طور پر ثابت شدہ یا کم از کم قابلِ فہم بنا دیا ہے۔ تاہم اسلام کے داعیوں نے ابھی تک اس کو واقعی معنوں میں استعمال نہیں کیا ———

موافق امکانات

دعوتِ دین کا کام انتہائی مشکل کام ہے مگر اللہ نے اپنی خصوصی رحمت سے اس کو

ہمارے لئے آسان بنا دیا ہے اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسانی تاریخ میں ایسی تبدیلیاں کیں جس نے ہمارے لئے نئے مواقع کھول دیئے۔ موجودہ زمانہ میں یہ تاریخی عمل اپنی آخری حد کو پہنچ گیا ہے۔ حتیٰ کہ اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ جو کام پہلے "خون" کے ذریعے کرنا پڑتا تھا۔ اس کو اب قلم کی سیاہی کے ذریعے انجام دیا جا سکے ——

اس عملِ تیسیر کے تین خاص پہلو ہیں جن کی طرف قرآن میں اشارے کئے گئے ہیں۔

(۱) قرآن میں اہلِ ایمان کو یہ دعاء تلقین کی گئی کہ :——

ربنا ولا تحمل علینا اصراً کما حملتہ علی الذین من قبلنا ——	(خدایا! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے پچھلی امتوں پر ڈالا تھا) ——

اگر الفاظ بدل کر اس آیت کی تفسیر کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعوتِ توحید کا کام پچھلے داعیوں کو پابندیٔ رائے کے ماحول میں کرنا پڑتا تھا، اس کو ہمیں آزادیٔ رائے کے ماحول میں کرنے کا موقع عطا فرما۔ پہلے زمانہ میں یہ صورتِ حال تھی کہ توحید کا اعلان کرنے والے کو پتھر مارے جاتے۔ اس کو آگ میں ڈال دیا جاتا۔ اس کے جسم کو آرے سے چیر دیا جاتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے زمانہ میں حکومت کی بنیاد شرک پر قائم تھی، پچھلے زمانہ کے بادشاہ کو مفروضہ دیوتاؤں کے نمائندہ بن کر حکومت کرتے تھے، اس لئے جب کوئی شخص شرک کو بے بنیاد قرار دیتا تو اس زمانہ کے بادشاہوں کو محسوس ہوتا کہ وہ نظریاتی بنیاد ختم ہو رہی ہے جس پر انہوں نے اپنی حکومت کو قائم کر رکھا ہے ——

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو انقلاب آیا اس نے شرک کی اجتماعی حیثیت کو ختم کر کے اس کو ایک ذاتی عقیدہ توحید کی راہ پر ڈال دیا —— یہی وہ بات ہے جو قرآن میں ان الفاظ میں آئی ہے :——

وقاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ

اس سلسلے میں دوسری بات یہ ہے کہ اسلام نے جب توہم پرستی اور شخصی تقدس کا خاتمہ کیا تو نسلی بادشاہت کی بنیادیں بھی ہل گئیں، چنانچہ انسانی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا بالآخر یورپ پہنچ کر جمہوریت کی صورت میں مکمل ہوا۔ اس کے بعد شخصی حاکمیت کے بجائے عوامی حاکمیت کا اصول دنیا رائج ہوا، اور آزادیٔ رائے کو ہر آدمی کا مقدس حق تسلیم کر لیا گیا۔ اس عالمی فکری انقلاب نے داعیانِ حق کے لئے یہ عظیم امکان کھول دیا کہ وہ غیر ضروری رکاوٹوں سے بے خوف ہو کر ساری دنیا میں حق کے اعلان کا کام انجام دے سکیں ——

(۲) قرآن میں یہ اعلان کیا گیا کہ سنریھم ایاتنا فی الافاق و فی انفسھم حتیٰ یتبین لھم انہ الحق

(ترجمہ) ہم عنقریب آفاق میں اور انفس میں ایسی نشانیاں دکھائیں گے جس سے کھل جائے گا کہ یہ سراسر حق ہے) —— قرآنِ کریم کی اس آیت میں اس انقلاب کی طرف اشارہ ہے جس کو جدید سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے ——

کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کی دلیل ہے، تمام مخلوقات اپنے خالق کی صفات کا اظہار کر رہی ہیں، گویا کائنات قرآن کی دلیل ہے۔ تاہم یہ دلیل سائنسی انقلاب سے پہلے بڑی حد تک غیر دریافت شدہ حالت میں پڑی ہوئی تھی، اس دریافت کے لئے ضروری تھا کہ چیزوں کی گہرائی کے ساتھ تحقیق کی جائے مگر شرک کا عقیدہ اس تحقیق کی راہ میں حائل تھا۔ مشرک انسان کائنات کے مظاہر کو پرستش کی چیز سمجھے ہوئے تھا۔ پھر وہ اس کو تحقیق کی چیز کیسے بناتا ——

توحید کے عمومی انقلاب نے اس رکاوٹ کو ختم کر دیا۔ اسلامی انقلاب کے بعد کائنات کے تقدس کا ذہن ختم ہو گیا۔ اب کائنات کے مظاہر پر آزادانہ غور و فکر شروع ہو گیا۔ یہ کام صدیوں تک عالمی سطح پر جاری رہا۔ یہاں تک کہ بالآخر وہ یورپ

پہنچا۔ یورپ میں اس کو موزوں زمین ملی۔ یہاں اس نے تیزی سے ترقی کی۔ یہاں وہ عظیم فکری انقلاب ظہور میں آیا جس کو موجودہ زمانہ میں سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔
سائنسی تحقیق کے ذریعے کائنات کے جو حقائق معلوم ہوئے وہ قرآن کی دعوت کو قطعیات کی سطح پر ثابت کر رہے ہیں ——

(۳) اس سلسلے میں تیسری چیز وہ ہے جس کی طرف قرآن کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے :——

عسیٰ ان یبعثک ربک مقاماً محموداً۔	قریب ہے کہ اللہ تم کو ایک مقام محمود پر کھڑا کرے ——

محمود کے معنی ہیں "تعریف کیا ہوا"، تعریف دراصل تسلیم واعتراف کی آخری صورت ہے۔ کسی کو ماننے والا جب اس کو ماننے کی آخری حد تک پہنچتا ہے تو وہ اس کی تعریف کرنے لگتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی اسکیم یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم شدہ نبوت کے مقام پر کھڑا کرے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں بھی محمود تھے اور آخرت میں بھی محمود ——

خدا کی طرف سے ہر دور میں اور ہر قوم میں پیغمبر آئے۔ یہ سب سچے پیغمبر تھے ان سب کا پیغام بھی ایک تھا مگر مختلف اسباب سے ان پیغمبروں کو تاریخی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ تاریخی ریکارڈ کے مطابق آج کے انسان کے لئے ان پیغمبروں کی حیثیت نزاعی نبوت کی ہے نہ کہ مسلّمہ نبوت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تاریخی طور پر ایک ثابت شدہ نبوت ہے، جب کہ دوسرے نبیوں کی نبوت تاریخی طور پر ثابت شدہ نہیں ——

اس بنا پر آج یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ہم تسلیم شدہ نبوت کی سطح پر دین کی دعوت دے سکیں۔ جب کہ اس سے پہلے ہمیشہ متنازعہ نبوت کی سطح پر دین کی دعوت دینی پڑتی تھی ——

یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں مقام محمود (الاسراء ۷۹) کہا گیا ہے۔ نبوّت تاریخی ہی کا دوسرا نام نبوّت محمودی ہے۔ پیغمبر آخر الزمان صلّی اللہ علیہ وسلّم کو مقام محمود پر کھڑا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ دوسرے پیغمبروں کی طرح تاریخی طور پر کوئی نامعلوم شخصیّت یا غیر ثابت شدہ شخصیّت نہیں ہوں گے۔ بلکہ آپ تمام انسانوں کے لئے پوری طرح ایک معلوم اور معلّم شخصیت ہوں گے۔ آپ کی سیرت بھی ایک محفوظ سیرت ہو گی اور آپ کی تعلیم بھی ایک محفوظ تعلیم ——

انسان پیدائشی طور پر اپنی فطرت میں خدا کی طلب لے کر پیدا ہوتا ہے، چنانچہ اس کو سچائی کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ انسانی علوم میں اپنی طلب کا جواب دریافت کرنا چاہتا ہے مگر وہ دریافت نہیں کر پاتا، پھر وہ مذاہب کا مطالعہ کرتا ہے تو پاتا ہے کہ موجودہ تمام مذاہب تاریخی پہلو سے غیر محفوظ ہیں۔ انہیں تاریخی اعتباریت کا درجہ حاصل نہیں۔ یہاں ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ انسان سے کہہ سکیں کہ تم جس چیز کی تلاش میں ہو وہ محفوظ اور مستند حالت میں ہمارے یہاں موجود ہے۔ دوسرے کے پاس صرف غیر تاریخی پیغمبر جن کو وہ دنیا کے سامنے پیش کریں۔ مگر اسلام کا پیغمبر مکمّل طور پر ایک تاریخی پیغمبر ہے۔ تاریخ کے مسلّمہ معیار کے مطابق آپ کے بارہ میں کسی قسم کا شک کرنے کی گنجائش نہیں۔ دوسروں کے پاس متنازعہ نبوّت ہے اور اسلام کے پاس مسلّمہ نبوّت ——

یہ اللہ تعالیٰ کی انتہائی عظیم نعمت ہے اس نے ممکن بنا دیا ہے کہ خدا کے دین کی دعوت آج مسلّمہ نبوّت کی سطح پر دی جائے، جب کہ اس سے پہلے وہ صرف متنازعہ نبوّت کی سطح پر دی جا سکتی تھی ——

قرآن میں

ساری کائنات کو توحید کی دعوت دینے کا فطری اسلوب

دُنیا میں جتنے پیغمبر آئے ان میں سے ہر ایک نے اس قادر مطلق کی طرف لوگوں کو دعوت دی مگر یہ دعوت ان کے ایک مسلّم دعویٰ کی حیثیّت سے تھی، انہوں نے اس دعویٰ کو دلائل کا محتاج نہ سمجھا اور حقیقت میں جن نا محدود زمانوں میں قوموں کیلئے ان کی بعثت ہوئی، ان میں دلیل اور بُرہان کی ضرورت بھی نہ تھی، کیونکہ ان زمانوں میں بُت پرستی، ستارہ پرستی، اور فطرت پرستی کا رواج نہ تھا، الحاد کا وجود نہ تھا، لیکن محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت عمومی تھی جو آخری زمانہ تک کے لئے اور تمام قوموں کیلئے تھی اور علم الٰہی میں یہ تھا کہ بعثتِ محمّدیؐ کے بعد عقلِ انسانی تحقیق و تلاش کے آخری مراحل طے کرنا چاہے گی اور قدرت کے سربمہر خزانے وقف عام ہوں گے اور عقلیت کا دَور دَورہ ہوگا اور ہر شے دلیل و ثبوت کی محتاج قرار پائے گی، اس لئے محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو دلائل و براہین ثبوت اور شواہد کی بھی تلقین کی گئی ——

ایک اور سبب یہ ہے کہ انبیائے سابقین صرف اپنی قوموں کی دعوت پر مامور ہوئے

جن میں مُشرکین کا وجود تھا، ملحدین کا تھا لیکن خاتم الانبیا صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت تمام طبقوں اور قوموں کے لئے ہوئی، اس لئے آپؐ کی دعوت میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ آپؐ انسانی عقل کی ہر صنف کو مخاطب کر رہے ہیں اور اس کے معیار اور سطح کے مطابق اس قادرِ مطلق کی ہستی اور وجود پر دلیلیں بھی پیش کر رہے ہیں، اس لئے آپؐ نے دوسرے پیغمبروں کی طرح صرف مُشرکوں کو مخاطب نہیں فرمایا، بلکہ مُشرکوں، کافروں، ملحدوں، مشککوں اور دہریوں، ہر ایک کو مخاطب فرمایا اور ان میں سے ہر کی تسکین و تشفی کا سامان بہم پہنچایا ——

ایک قادرِ مطلق، خالقِ عالم اور صانعِ کائنات کی ہستی کے ثبوت اور انکار پر جب سے فلسفہ کا وجود ہے ہمیشہ بحثیں پیدا ہوئیں اور دلیلیں پیش کی جاتی رہی ہیں، مصر، یونان ہندوستان، اسلامی ممالک اور آج یورپ میں بھی اس مسئلہ پر عقلائے زمانہ نے اپنی جودتِ ذہن نکتہ رسی اور دقیقہ فہمی کا بہترین ثبوت پیش کیا ہے، مگر غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ دلائل کی زبان اور طرزِ تعبیر میں گو تبدیلی ہوتی رہی ہے مگر اصل مغزِ سخن صرف ایک ہے۔ اس بنا پر وحیِ محمدیؐ نے اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وجود پر جو دلیل قائم کی اس میں اسی مغز کو لے لیا ہے اور نہایت مؤثر طرزِ ادا میں اس کو بار بار دُہرایا اور انسانوں کو متنبہ کیا ہے ——

وحیِ محمدیؐ کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہے کہ اس ایک قادرِ مطلق، خالقِ عالم اور صانعِ کائنات ہستی کا اعتراف انسانی فطرت میں داخل ہے، متمدن سے متمدن اور وحشی سے وحشی قوم میں بھی اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے۔ آثارِ قدیمہ کی تحقیقات نے سینکڑوں مُردہ اور گمنام قوموں کی تاریخ کا سراغ لگایا جس میں سامانِ تمدّن، اعلیٰ خیالات اور علوم کی لاکھ کمی محسوس ہوتی ہو مگر مذہبی عقیدت اور کسی خدا کے اعتراف کی کمی بالکل نظر نہیں آتی، ان کی عمارتوں کے منہدم کھنڈروں میں جو چیز سب سے پہلے ملتی ہے وہ کسی معبد کی چہار دیواری ہوتی ہے۔ آج دُنیا کے مختلف گوشوں میں جو بالکل وحشی قومیں ملتی ہیں وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں عالم کے خالق اور کائنات کے صانع کے تخیّل سے بہرہ ور ہیں، غرض جماعتِ انسانی کا کوئی حصّۂ زمین کا کوئی گوشہ، زمانہ کا

کوئی گوشہ، زمانی کا کوئی عہد اس تخیّل سے خالی نہیں ملتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اعتراف بھی انسان کے فطری تصوّرات اور وجدانی جذبات داخل ہے۔ اسی لئے وحیِ محمدیؐ نے اس کو فطرت سے تعبیر کیا ہے ــــ

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ــــ	اپنا منہ سب طرف سے پھیر کر دین کی طرف کر، یہ خدا کی وہ فطرت ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا، خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں یہی سیدھا اور ٹھیک دین ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں ــــ

انسان کا یہ جذبۂ فطرت کبھی کبھی خارجی اثرات سے دب جاتا ہے۔ وحیِ محمدیؐ نے بار بار انسان کے اس دبے ہوئے جذبہ کو اُبھارا ہے اور اسی زیرِ خاکستر آگ کو ہوا دی ہے اور انسان کو اس کا بھولا ہُوا وعدہ یاد دلایا ہے، وہ انسانوں سے پوچھتی ہے:۔

اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (ابراہیم)	کیا آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے خُدا میں شک ہے ــــ

اور ایک اور مقام پر اس نے کہا:ــ

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ــ (طور : ٢)	کیا وہ آپ ہی آپ بن گئے یا وہی اپنے آپ خالق ہیں یا ان ہی نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے (یہ بات نہیں ہے) بلکہ ان کو یقین نہیں ہے۔

دُنیا اور کائنات جس میں انسان بھی شامل ہے اور جو اپنی عقل اور فہم کی بنا پر سب سے بالاتر ہے۔ بہر حال موجود ہے اور اس کے وجود میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ

کس کے بن بنائے وہ کائنات آپ سے آپ بن گئی ہے۔ یا خود اس نے اپنے آپ کو بنالیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں باطل ہیں۔ نہ آپ سے آپ کوئی چیز بن سکتی اور نہ کوئی مفعول اپنا فاعل آپ بن سکتا ہے۔ اگر کوئی بے وقوف یہ کہے کہ نر اور مادّہ مِل کر اپنا بچّہ پیدا کرتے ہیں تو اس سے پوچھا جائے گا کہ سلسلہ توالد و تناسل کا آغاز کیونکر ہوا اور اوّلیں نر و مادّہ اور رُوح کا خالق کون ہے ——

یہ گوناں گوں عالم —— یہ رنگارنگ کائنات —— یہ تاروں بھرا آسمان، یہ بوقلموں زمین —— یہ سُورج —— یہ چاند —— یہ درخت —— یہ سمندر —— یہ پہاڑ —— یہ لاکھوں جاندار اور بے جان اشیاء —— یہ علل واسباب کا تسلسل —— یہ تغیّر وانقلاب کا نظام —— یہ کائنات کا نظم اور اس کے ذرّہ ذرّہ کا قاعدہ وقانون —— انسان کے اندرونی قویٰ اور ان کی باہمی ترتیب —— موت وحیات کے اسرار —— خواص وقویٰ کے رموز اور انسان کی خیالی بلند پروازی —— اور عملی عجز و درماندگی۔ یہ تمام باتیں ایک خالق وصانع کے اعتراف پر مجبور کرتی ہیں —— یہ نیلگوں آسمان کی چھت، یہ زمین کا سبزہ زار فرش اور ایک ہی حرکت سے شب وروز کا انقلاب کا خالق کل کا پتہ دیتا ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (آل عمران)	آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدلنے میں عقلمندوں کیلئے معرفتِ الٰہیہ کی نشانیاں ہیں۔

یہ شب وروز کا نور و ظلمت، یہ سورج اور یہ چاند کی روشنی، ان کی مقرّر رفتار اور باقاعدہ طلوع وغروب اس کی دلیل ہے کہ اس ابلق ایّام پر کوئی سوار ہے جس کے ہاتھ میں اس کا سیاہ وسپید ہے ——

وَمِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَالنَّهَارُ —— اور اس کی نشانیوں میں سے رات

وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ — دن اور سورج اور چاند ہیں —

آسمان اور زمین کی پیدائش، دن اور رات کا الٹ پھیر، تو ہے، دیکھو کہ خطرناک سمندروں میں کس طرح لوگ ملک سے دوسرے ملک کو تجارت کا سامان لے کر دوڑتے پھرتے ہیں، اگر پانی میں مٹی کا اور لوہے کا ذرہ بھی ڈالو تو فوراً ڈوب جائے گا۔ مگر یہ لاکھوں من کے لدے ہوئے جہاز کیسے پھول کی طرح پانی میں تیر رہے ہیں۔ جس طرح فطری قاعدہ کے بموجب یہ عمل ظہور میں آرہا ہے وہ جس کے حکم سے بنا ہے اس کا کتنا بڑا احسان ہے، پھر ان سمندروں سے بخارات اٹھتے ہیں، وہ اوپر جا کر بادل بنتے ہیں اور وہ وہیں پہنچ کر برستے ہیں جہاں پیداوار اور زمین کی نشوونما کی حاجت ہے اور پھر وہاں بادل ہواؤں کے تخت پر بیٹھ کر کیسے ادھر ادھر ضرورت کے مطابق اڑتے پھرتے ہیں —

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (بقرہ : ۲۰)	بے شبہ آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور دن رات کے الٹ پھیر میں اور ان جہازوں میں جو انسانوں کیلئے فائدہ رساں سامان لے کر سمندروں میں چلتے ہیں اور آسمان سے اس کے پانی برسانے میں اور پھر اس پانی کے ذریعہ مردہ زمین کو زندگی بخشنے میں اور زمین میں ہر طرح کے چلنے والوں کے پھیلانے میں اور ہواؤں کے کبھی ادھر اور کبھی ادھر بدلنے میں اور آسمان و زمین کے بیچ میں جو بادل

کام میں لگے ہیں ان سب میں سمجھ بوجھ والوں کیلئے معرفت الٰہیہ کی بڑی نشانیاں ہیں

آسمان اور زمین کی عجیب و غریب خلقت کے ساتھ خود انسان کی اپنی پیدائش کی حکایت کتنی عجیب ہے ــــــ

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا فِیْ خَلْقِكُمْ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (جاثیہ)

بے شک آسمانوں میں اور زمین میں ایمان والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور خود تمہاری پیدائش میں جو پھیلنے والے پھیلائے ان میں یقین کرنیوالوں کیلئے توحید کی دلیلیں ہیں ــــــ

سورۂ انعام میں نباتات اور ان کی نیرنگیوں کو اپنی ہستی کی دلیل میں پیش کیا۔ یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ایک ہی زمین ہے جس میں سے وہ اُگتے ہیں، ایک ہی پانی ہے جس سے وہ سینچے جاتے ہیں۔ ایک ہی ہوا ہے جس سے وہ سانس لیتے ہیں مگر کتنے رنگ برنگے پھول، پھل، میوے اور درخت لگتے ہیں جن میں سے ہر ایک کا رنگ، ہر ایک کا مزہ، ہر ایک کی پتی، ہر ایک کا قد و قامت، ہر ایک کے خواص اور فائدے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہوتے ہیں ــــــ

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۔ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ج وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَیْرَ

اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اُتارا، پھر ہم نے اس سے اُگنے والی ہر چیز نکالی، پھر اس سے سبز خوشے نکالے، جن سے ہم جڑے دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے گابھے میں سے لٹکتے گچھے اور انگور کے باغ اور زیتون اور انار ہم شکل اور جدا جدا شکل کے جب وہ پھلیں تو ان کے پھل اور

مُتَشَابِهٍ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ —

کو دیکھو بے شک ان میں ایمان والے لوگوں کے لئے **توحید** کے بہترین شواہد ہیں۔

سورۂ روم میں پہلے مٹی سے انسان کی پیدائش کو پھر اس عورت مرد کے جوڑے ہونے کو اور ان کے درمیان مہر و محبّت کے جذبات کے ظہور کی اپنی ہستی کو دلیل بتایا ہے، پھر اپنی قدرت کے دوسرے عجائبات کو جو آسمان سے زمین تک پھیلے ہیں ایک ایک کر کے پیش کیا ہے، اوّل تو خود انسانوں کی پیدائش، پھر ان میں عورت مرد ہونا اور ان کے درمیان جذبات کی لہر ہونا، پھر مختلف قوموں کی زبانیں، شکلیں اور رنگوں کو دیکھ کہ ایک سے ایک الگ ہے، پھر انسانوں کے اندر کے اعمال کو دیکھو، ایک نیند ہی کی حقیقت پر غور کرو یہی دلائل تمہاری آنکھیں کھول دینے کیلئے کافی ہیں —

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹّی سے بنایا پھر تم آدمی بن کر چلتے پھرتے ہو، اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہارے جوڑے بنائے کہ کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تم سب کے درمیان پیار اور مہر رکھا اور اس میں ان لوگوں کے لئے جو سوچتے ہیں (دلیلیں ہیں) اور اسی کی نشانیوں میں سے آسمانوں کی اور زمین کی بناوٹ اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کی

بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ، وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ، وَمِنْ اٰيٰتِهٖ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ـــ (روم : ۳)

بوقلمونی ہے۔ اس میں جاننے والوں کیلئے یقیناً دلیلیں ہیں اور اس کی عجیب قدرتوں میں سے تمہارا رات اور دن میں سونا اور تمہارا اس کی مہربانیوں کو تلاش کرنا ہے اس میں ان کے لئے جو سنتے ہیں دلیلیں ہیں اور اس کے عجائب قدرت میں سے یہ بھی ہے کہ تمہیں وہ بجلی کی چمک دکھاتا ہے جس سے تم ڈرتے ہو اور کبھی (رحمت کی بارش کی) امید رکھتے ہو اور وہ آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اس میں ان کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں دلیلیں اور اس کی دلیلوں میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے اپنے اپنے مقام پر قائم ہیں

اس آخیر آیت میں آسمان اور زمین کے اسکے حکم سے قائم رہنے کا ذکر ہے، تم کہتے ہو کہ یہ باہمی جذب و کشش سے قائم ہیں ـــ لیکن خود یہ جذب و کشش کس کی کشش کا نتیجہ ہے؟ یہ خود حیرت انگیز نتیجہ ہے؟ یہ خود حیرت انگیز ہے، سورہ لقمان میں آسمانوں کے بلا کسی نظر نہ آنے والے سہارے کے کھڑے ہونے اور زمین کے اپنی جگہ پر ٹھہرے ہونے کا ذکر ہے یہ نظر نہ آنے والا سہارا قوتِ کشش ہی ہی لیکن وہ بھی تو اسی کے اسرار میں سے ہے، اس کے بعد ایک جاندار و بےحیات مردہ زمین کے اندر سے پانی برسنے کے ساتھ انواع واقسام کی زندگی کے نمونوں کا ابھرنا کتنا حیرت ہے، یہ بھی اس کی قدرت کا ثمرہ ہے ـــ

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ ـــ اس نے آسمانوں کی چھت کو کسی ایسے

تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ط وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ۔ (لقمان: ۱)

ستون کے بغیر کھڑا کیا ہے جو تم کو نظر آتے ہوں اور زمین میں ایسے کھونٹے ڈال دیئے کہ وہ تم کو لے کر ہل نہ جائے اور اس نے اس زمین پر ہر قسم کے چلنے پھرنے والے پھیلائے اور آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اسی زمین سے ہر چیز کے اچھے جوڑے پیدا کیے ——

سورۂ سجدہ میں انسان کی پیدائش کا مٹی سے آغاز، پھر قطرۂ آب (نطفہ) سے ذریعہ توالد و تناسل، پھر اس کے سڈول جسم کا بن جانا، پھر اس مٹی کے مُردہ قالب میں دفعتًہ کہیں سے زندگی کا آجانا اور اس میں رُوح کا داخل ہو جانا اور اس میں علم کا حواس کے حیرت انگیز آلات کا پیدا ہو جانا —— ان سب کو اپنی صنعت میں پیش کیا ہے ——

اَلَّذِىْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَىْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (السجدہ: ۱)

وہ جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی اور انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی پھر اس کی نسل نچڑے پانی سے بنائی پھر اس کو سڈول کیا اور اس میں اپنے حکم سے رُوح کو داخل کیا اور تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنا دیئے تم ہمارے ان احسانوں کا بہت ہی کم شکر ادا کرتے ہو ——

مُردہ زمین کے اندر کیا کیا قوتیں ودیعت ہیں اور خود انسانوں کے جسم و جان میں عجائبات کا کتنا خزانہ رکھا ہے، لیکن کوئی صاحبِ نظر ادھر نہیں دیکھتا، انسان کی زندگی،

اس کے اندرونی جذبات، حواس، ذہنی قویٰ اور دماغی حرکات، ان میں سے ہر شئے معمّہ ہے۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (ذاریات: ۱)	اور زمین میں یقین کرنے والوں کیلئے نشانیاں ہیں اور خود تمہاری جانوں کے اندر بھی نشانیاں ہیں کیا تم نظر نہیں کرتے

جانوروں کے جسموں کے اندر جو عجیب و غریب نظام ہے، وہ بھی غور کے قابل ہے ایک ہی گھاس پھوس کی غذا ان کے پیٹ میں جاتی ہے، پھر اس کا کچھ حصّہ لید اور گوبر، کچھ خون اور کچھ دُودھ بن جاتا ہے اور اسی لید اور گوبر کے باہر آنے کے راستوں اور سُرخ خون کی رگوں کے درمیان سے خالص سپید، شیریں دُودھ کی دھاروں کا نکلنا کتنا عجیب ہے۔

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۖ نُّسْقِيكُم مِّمَّا فِي بُطُونِهِ مِن بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِّلشَّارِبِينَ (نحل ۹)	اور تمہارے لئے جانوروں میں عبرت ہے۔ ہم تمہیں ان کے پیٹوں کے اندر سے لید اور خون کے درمیان سے پینے والوں کے لئے خالصًا اور خوشگوار دُودھ پلاتے ہیں۔

ایک ہی قسم کے پھل ہیں، اگر ان کو ایک طرح سے کھاؤ تو تمہاری عقل اور قوت کو بڑھاتے ہیں اور دوسری طرح کھاؤ تو عقل کو ضائع کر دیتے ہیں۔ جیسے انگور سے شراب بنائیں تو اس سے عقل پر بُرا اثر پڑتا ہے

وَمِن ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَرِزْقًا حَسَنًا ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ	اور چھوہاروں اور انگوروں کے پھلوں کو دیکھو کہ ان میں سے تم نشہ اور اچھی روزی بھی حاصل کرتے ہو اس میں عقل والوں کیلئے

يَعْقِلُوْنَ ۔ (نحل: ۹) ـــ بہترین دلیل ہے ـــ

زمین اور زمین پر کی مخلوقات کو چھوڑ کر اوپر آسمان کی طرف نظر اُٹھاؤ، سورج کا روشن چراغ اور چاند کی خوشنما قندیل کتنی عجیب ہے، پھر سورج کو دیکھو کہ سال کے بارہ مہینوں میں آسمان کے بارہ بُرج طے کر کے کس طرح زمین میں مختلف موسموں اور زمانوں کو نمایاں کرتا ہے ـــ

تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا (فرقان)	بابرکت ہے وہ ہستی جس نے آسمانوں میں بُرج بنائے اور ان میں ایک چراغ اور چمکانے والا چاند بنایا ـــ

ان ہی چند چیزوں تک اس کی قدرت کے عجائبات محدود نہیں بلکہ ہر شے اپنی خلقت، اپنی محکم روش اور اپنے قانون سے اس کی گواہی دیتی ہے ـــ

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ (نمل ۷)	اس اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر شے کو مضبوط (نظام پر) بنایا۔

اس کی صنعت ہر قسم کے عیب سے پاک ہے، اس میں مستحکم نظم و نسق کی بندش نظر آتی ہے ـــ

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ ۔ (مُلک)	تجھے اس خدا کی بناوٹ میں کوئی بے رابطی نظر آتی ہے؟ پھر نگاہ کر، کیا کوئی فطور دکھائی پڑتا ہے؟ پھر دوبارہ نظر کر، تیری نگاہ تھک کر تجھ تک پلٹ کر آئیگی مگر ہماری اس بناوٹ میں کوئی نقص نہ پاسکے گی ـــ

اس قسم کی اور سینکڑوں آیتیں ہیں جن کا استقصا بھی مشکل ہے۔ ان آیتوں میں تین قسم کے دلائل ہیں ـــ

۱ ـــ قدرت کے عجائبات اور نیرنگیاں، اور پھر ان کا ایک قانون کے ماتحت ہونا۔
۲ ـــ عالم کا نظم و نسق اور اس کا مرتّب شدہ سلسلہ ـــ
۳ ـــ کائنات اور سلسلہ عالم کی ہر کڑی میں بے انتہا مصلحتوں، حکمتوں اور فائدوں کا ہونا ـــ

ان مقدمات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے یہ عجائبات اور اس کے یہ منظّم علل و اسباب، خود بخود بخت و اتّفاق سے نہیں بن گئے، بلکہ کسی حکیم و دانا اور قادرِ مطلق صانع نے اپنی قدرت اور ارادہ سے ان کو بنایا ہے ـــ

اہلِ فلسفہ اور متکلّمین عالم کے وجود پر عموماً یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ ہم بداہتہً دیکھتے ہیں کہ عالم میں ہر چیز کے لئے اسباب کا سلسلہ ہے۔ یہ سلسلہ یا تو کہیں جا کر ختم ہو گا یا یوں ہی مسلسل چلا جائے گا۔ اگر یوں ہی مسلسل چلا جائے گا تو لازم آتا ہے کہ ہر چیز کے پیدا ہونے کے غیر متناہی علل گزر جائیں اور غیر متناہی علل کا خاتمہ نہیں ہو سکتا اور نہ کہیں ان کا آغاز ہو سکتا ہے، اس لئے کوئی چیز پیدا بھی نہیں ہو سکتی، تسلسل عقلاً بھی محال ہے، بلکہ انسان اس کے تخیّل سے بھی عاجز ہے اس بنا پر لامحالہ سلسلہ علل کا کہیں خاتمہ ہونا بھی ضروری ہے جس علّتِ کُل پر تمام علّتیں ختم ہو جاتی ہیں وہی خلق و پیدائش اور وجود کی اصلی علّت العلل ہے۔

قرآن پاک کی ایک دو آیتوں میں بھی اس دلیل کا ماخوذ مذکور ہے۔ سورۂ ہود کے آخر میں ہے:۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ (ہود۔ ۱) ـــ	اور خدا ہی کے پاس ہے آسمانوں اور زمین کی چھپی بات اور اسی کی طرف ہر بات لوٹائی جاتی ہے تو اس کی عبادت کر اور اسی پر بھروسہ کر ـــ
وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ۔ (نجم)	یہ کہ تیرے ربّ کی طرف ہر چیز کی انتہا ہے ـــ

دل میں وسوسوں کا آنا اور پھر ان وسوسوں کو زبان پر لانا اسے گناہ سمجھے، یہ کیفیت ایمانی کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی طرح آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے فرمایا، لوگ علم و دانش کا سوال کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ اس کو تو خدا نے پیدا کیا اور پھر اس خدا کو کس نے پیدا کیا، آسمان کو خدا نے بنایا، زمین کو خدا نے بنایا، یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے پھر پوچھتے ہیں تو پھر خدا کو کس نے پیدا کیا۔ فرمایا یہ شیطانی وسوسہ ہے، جب یہ حالت کسی کو پیش آئے تو کہہ دے

اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ——— میں اللہ پر ایمان لایا ———

یہ تعلیم درحقیقت اسی مسئلہ کی ہے کہ خدا پر تمام علتوں کی انتہا ہے اور اس کے بعد کوئی علت نہیں، اس لئے یہ وسوسہ لائق جواب نہیں۔ یہ جہالت اور نادانی کا سوال ہے۔

توحید پر عقلی دلیلیں

اگر کوئی عالم کا خالق و صانع ہے تو وہ یقیناً ایک ہے دو نہیں۔ تاہم دنیا میں ایسے عقل مندبھی ہیں، جو دو تین بلکہ متعدد خداؤں کے قائل ہیں اور عالم کی ایک مملکت کو سینکڑوں حصّوں میں تقسیم کر کے ان کو مختلف خداؤں کی حکومتیں قرار دیتے ہیں۔ وحی محمدی نے اس شرک کے ابطال پر سب سے زیادہ جس دلیل کو پیش کیا ہے وہ نظام عالم کی یکسانی اور وحدت اور کائنات کے علل و اسباب کا باہمی توافق، تعاون اشترک اور اتّحاد ہے۔ دنیا میں ایک ذرہ بھی اس وقت تک پیدا ہو نہیں سکتا جب تک آسمان سے لے کر زمین تک کی تمام کارکن قوتیں اور اسباب ایک دوسرے کے موافق و مناسب نہ ہوں اور باہم ان میں اشتراکِ عمل نہ ہو، ایک دانہ زمین سے اُس وقت تک اُگ نہیں سکتا جب تک دانہ اُگنے کے لائق نہ ہو، زمین میں اُگانے کی صلاحیت نہ ہو، موسم اس کے مناسب نہ ہو، بارش موافق نہ ہو۔ آفتاب سے اس کو گرمی اور روشنی اس کے مزاج کے مطابق نہ پہنچے، پھر اس کے اُگنے کے موانع اور عوائق ایک ایک کر کے دفع نہ ہوں ان سب مراحل کے بعد وہ دانہ اُگے گا، اور پھل لائے گا، قرآن پاک نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے ———

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ۔

اگر زمین و آسمان میں اس ایک خدائے برحق کے سوا اور خدا بھی موجود ہوتے تو زمین و آسمان برباد ہوجاتے اے عرش والا خدا تو ان باتوں سے پاک ہے جو مشرک لوگ آپکے بارے میں کہتے ہیں۔

آسمان و زمین کا یہ تمام کاروبار، یہ تمام قوانین قدرت، اگر ایک کے بجائے دو طاقتوں کے ہاتھوں میں ہوتے تو یہ باہمی تصادم میں ایک لمحہ کے لئے بھی قائم نہ رہتے۔ فلسفیانہ اصطلاحات میں اس مطلب کو ادا کرو، تو یوں ہوگا کہ عالم کائنات معلول ہے اس کی کوئی علّت تامہ ہوگی۔ یہ ظاہر ہے ایک معلول کی دو علّت تامہ نہیں ہوسکتیں، کیونکہ علّت تامہ اس کو کہتے ہیں جس کے وجود کے بعد معلول کے وجود میں کسی اور چیز کا انتظار نہ ہو۔

اب عالم کی علّت تامہ اگر ایک نہ ہو بلکہ دو ہوں تو سوال یہ ہے کہ ایک علّت تامہ کے وجود کے بعد عالم کے وجود میں دوسری علّت تامہ کا انتظار رہے گا یا نہیں، اگر رہے گا تو پہلی شے علّت تامہ نہیں رہے گی اور اگر انتظار نہ رہے گا تو دوسری شے علّت تامہ نہ ہوگی۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ عالم کی اعلّت تامہ ایک ہی ہوسکتی ہے ۔۔۔۔

توحید کے ثبوت اور شرک کے ابطال کی دوسری دلیل نظام عالم کی وحدت ہے سورج، چاند اور تاروں سے لے کر انسان، حیوان، ہوا، پانی، درخت، گھاس پات تک کو دیکھو تو معلوم ہوگا سب ایک مقررہ نظام اور بندھے اصول کے ماتحت ہیں، جن میں کبھی سرمو فرق نہیں ہوتا، ہر شے ایک اصول کی پابند اور ایک عادت جاریہ کے مطابق رہی ہے۔ گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب میں یکسانی اور مساوات کی ایک خاص وحدت قائم ہے اور وہ سب کسی ایک ہستی کے اشارے پر چل رہے ہیں۔

وَمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّـ اور نہ اس خدائے برحق کے ساتھ کوئی

لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰـهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۔ (مومنون : ۵)	اور خدا ہے اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو الگ لے جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھ جاتا ——
قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۝ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا، تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (بنی اسرائیل ۵)	کہ اگر خدائے برحق کے ساتھ کچھ اور خدا ہوتے جیسا کہ (یہ مشرکین) کہتے ہیں تو ایسی حالت میں وہ تخت والے (حکمران) خدا سے حکومت چھیننے کا راستہ ڈھونڈھتے، پاک اور بلند ہے وہ (خدا) اس بات سے جس کو یہ (مشرک) کہتے ہیں۔ اس (خدائے برحق کی پاکی ساتوں آسمان اور زمین اور جو

ان کے اندر ہے بیان کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی پاکی کی گواہی نہ دیتی ہو ——

اسی وحدتِ نظام کے استدلال کو خدائے تعالیٰ نے ایک اور آیت میں بیان فرمایا ہے۔

مَا تَرٰى فِىْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ (ملک)	تو خدا کے بنائے میں کوئی فرق نہیں دیکھتا، پھر نگاہ کر، کیا کوئی فطور تجھ کو دکھائی دیتا ہے؟ پھر دوبارہ نظر دوڑا، تیری نظر رد ہو کر تھک کر واپس آجائے گی ——

اس واقعاتی استدلال سے بڑھ کر جو بالکل نظم فطرت پر مبنی ہے کوئی

دوسری صحیح دلیل نہیں ہو سکتی، اسی لئے قرآنِ پاک نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ یہ دُنیا وحدتِ نظام ہی کے ماتحت چل رہی ہے۔ ورنہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی چل نہ سکے، اسی لئے اس دُنیا کے حاکم و فرماں روائے مطلق کی وحدت بخوبی ثابت ہے ——

خُدا کی ہستی کے آفاقی دلائل

کائنات کا ربّ العالمینی نظام شہادت دے رہا ہے کہ ہمارا اور ساری کائنات کا کوئی پیدا کرنے والا ہے اور وہی اپنی قدرت اور اپنے حکم سے اس سارے جہان کو چلا رہا ہے، اگر کوئی شخص بنیادہی کو نہ مانے تو اس کے نزدیک دین کے سلسلہ کی تمام باتیں بیوقوف انسانوں کے "توہمات" ہیں —— بہرحال خُدا کی ہستی کا مسئلہ دین و مذہب کا پہلا بُنیادی مسئلہ ہے، اور کوئی دینی دعوت اُن ہی لوگوں کو دی جا سکتی ہے جو پہلے اس بُنیاد کو تسلیم کر لیں مگر چونکہ واقعہ یہ ہے کہ خدا کی ہستی کے لئے خود اپنی ہستی کے علم کی طرح بالکل فطری اور بدیہی ہے جس کے لئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں
حتیٰ کہ ہمارے اس دور میں بھی جس کو لادینیت اور دہریت کا دور کہا جاتا ہے۔ انسانوں کی غالب ترین اکثریت خدا کی ہستی کی ماننے والی ہی ہے ——

اس سلسلے میں یہ ایک بات پہلے سمجھ لینے کی ہے کہ قرآن پاک خدا کی ہستی (اور اسی طرح دوسری ایمانی حقیقتوں) کو منوانے کے لئے منطقیوں کے طریقے پر بحث و مناظرہ نہیں کرتا ہے جس کے مقابلہ میں مخاطب اگرچہ لاجواب ہوجائے، لیکن اس کے دل میں اس سے یقین کی ٹھنڈک پیدا نہیں ہوسکتی، بلکہ قرآن پاک کا طریقہ یہ ہے کہ وہ انسانوں کی صحیح اور سلیم فطرت سے اپیل کرتا ہے کہ کائنات کا نظام جس کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو بلکہ تم خود اسی کے ایک جزو ہو، اس میں ذرا غور و فکر کرو، تم خود حقیقت کو پالو گے اور جو تم کو بتلایا جارہا ہے اس کی کھلی نشانیاں بچشم خود دیکھ لوگے، اور تمہارا یہ غور و فکر اور

مطالعہ ہی یقین و اطمینان کی ٹھنڈک تمہارے دلوں میں پیدا کر دے گا ـــــــ

قرآن میں ہے:ـــــ

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

(البقرہ ۔ ع ۔ ۲۰)

بلاشبہ آسمان و زمین کی ساخت میں اور رات دن کے یکے بعد دیگرے آنے میں اور اُن کشتیوں میں جہاز میں جو انسانوں کے کام کی چیزیں لے کر دریاؤں اور سمندروں میں چلتے پھرتے ہیں، اور اس بارش میں جسے اللہ آسمان سے برساتا ہے پھر اُس سے زمین کو ایک زندگی بخشتا ہے، بعد اس کے کہ وہ مُردہ ہو چکی ہوتی ہے اور اسی کے ذریعہ ہر قسم کے جاندار زمین میں پھیلا دیتا ہے، اور ہواؤں کے بدلنے میں اور اُن بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان مسخّر رہتے ہیں (تو ان سب چیزوں میں جن کو سب آنکھوں والے انسان اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں) عقل سے کام لینے والے لوگوں کے لئے خدا کے وجود پر کھلی نشانیاں ہیں۔

قرآن مجید نے یہاں آسمان و زمین کی ساخت، رات دن کی آمد و رفت کے معروف نظام، سمندروں میں، جہازوں کی چلت پھرت، بارش اور اُس کے آثار و نتائج، ہواؤں کے تغیّرات، اور آسمان و زمین کے درمیان ایک خاص نظام کے تحت رہنے والے

بادلوں کی طرف اشارہ کر کے انسانوں سے کہا ہے کہ ان چیزوں میں غور کرو، اگر تم عقلِ سلیم سے کام لوگے تو ان میں ہر چیز تمہیں زبان سے صاف صاف بتائے گی کہ وہ جو کچھ ہے اور جس حال میں ہے آپ سے آپ نہیں بنی بلکہ کسی حکیم و خبیر اور کامل القدرت ہستی نے اُسے ایسا بنا دیا ہے —— پھر سورۂ انعام میں ارشاد ہے : ——

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَ النَّوٰى يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۚ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ (الانعام ۔ ۱۲ع)	یقیناً اللہ ہے دانے اور گٹھلی کا پھاڑنے والا، وہ زندہ کو مُردہ سے نکالتا ہے اور مُردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے یہ سب کچھ کرنے والا اللہ ہی ہے پھر تم کدھر بہکے چلے جا رہے ہو۔

قرآن کہتا ہے کہ تم دیکھتے ہو کسی اناج کے ایک دانے یا کسی پھل کی گٹھلی کو زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے، نہ اُس دانے یا گٹھلی میں کوئی شعور و احساس ہے، نہ زمین، اور نہ ان میں سے کسی میں ارادہ کی کوئی طاقت ہے، یہ سب چیزیں بے جان ہیں، لیکن چند دنوں کے بعد نظر نہ آنے والی طاقت کا مخفی ہاتھ زمین کے اندر ہی اندر اُس دانے اور گٹھلی کو پھاڑتا ہے، اور اُس میں سے نہایت نرم و نازک ایک ریشہ نکلتا ہے، پھر وہ اپنے اُوپر والی مٹی کی تہوں کو چیرتا ہوا اُوپر نمودار ہو جاتا ہے، تو ذرا سوچو کہ مٹی میں دفن شدہ اس بے جان دانے یا گٹھلی کو کس نے پھاڑا، کس نے اُس میں سے وہ جاندار اکھوا نکالا، پھر سُوت کے دھاگے جیسے نرم و نازک اس اکھوے نے کس کی طاقت سے زمین کو چیر ڈالا — ؟ کیا تمہاری عقل میں آ سکتا ہے کہ اُس بے جان دانے، یا گٹھلی نے یہ سارے کام خود کر لئے یا بغیر کسی کرنے والے کے آپ سے آپ یہ سب کچھ ہو گیا —— ہرگز! یہ سب ایک حکمت و قدرت والی ہستی نے کیا اور وہ ہستی خدا کی ہستی ہے (اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى) ——

اور اُس کی قدرت صرف بے جان دانے اور گٹھلی ہی کے ساتھ یہ عمل نہیں کرتی ہے بلکہ اور بھی کتنی بے جان چیزوں سے وہ جاندار چیزیں پیدا کرتا ہے، اور اسی طرح کتنی ہی جاندار چیزوں سے بے جان چیزوں کو برآمد کرتا ہے —— اور تم یہ سب کچھ دیکھتے ہو، مثلاً بے جان انڈوں سے جاندار بچّوں کا نکلنا بھی دیکھتے ہو اور جانداروں میں سے بے جان مادّوں کے برآمد ہونے کا بھی مشاہدہ کرتے ہو —— خدا کی قدرت کی یہ کیسی کھُلی کھُلی نشانیاں تمہارے سامنے ہیں، پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کیوں اور کدھر بہک رہے ہو —— اور سُورۂ رعد میں ارشاد ہے: ——

وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُکُلِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝ (سورۂ رعد - ع - ۱)	اور دیکھو! زمین میں مختلف قطعے ہیں جو باہم ملے ہوئے اور پاس پاس ہیں، اور انگوروں کے باغات ہیں اور غلّہ کے کھیت ہیں اور کھجور کے درخت ہیں، اُن میں کچھ ایسے ہیں جو جڑ سے دوسرے درخت کے ساتھ جُڑے ہوتے ہیں اور کچھ ایسے جو اس طرح جُڑے نہیں ہوتے، ان سب چیزوں کو ایک ہی پانی سے سیراب

کیا جاتا ہے، اور پھر ان میں سے بعض کو بعض پر ہم مزہ میں فوقیت دیتے ہیں ان سب میں نشانیاں ہیں عقل سے کام لینے والوں کے لیے ——

قرآن کہتا ہے، زمین جس پر تم چلتے ہو اور جس سے تمہاری غذا پیدا ہوتی ہے، ذرا اُس کی اِس حالت پر تو غور کرو، کہ اُس کے باہم ملے ہوئے قطعوں میں بسا اوقات کیسا

کیسا فرق ہوتا ہے، ایک زیادہ پیداوار والا ہے۔ دوسرا کم پیداوار والا، ایک مثلاً گیہوں کی کاشت کے لیے زیادہ مناسب ہے اور دوسرا مثلاً کپاس کی کاشت کیلئے پھر کسی ٹکڑے میں انگور کی بیلیں ہیں اور اُن سے انگور اُترتے ہیں اور اسی کے برابر والے دوسرے ٹکڑے میں مثلاً غلّہ کا کھیت ہے جس میں سے غلّہ پیدا ہوتا ہے، اور ساتھ ہی تیسرے ٹکڑے میں کھجور کے درخت ہیں اور وہ بھی سب یکساں نہیں، بلکہ مختلف طرح کے ہیں، الگ الگ اکہرے بھی ہیں، اور ایک ہی جڑ سے نکلے ہوئے کئی کئی جڑے ہوئے بھی ہیں —— پھر حال یہ ہے کہ سب کو ایک پانی ملتا ہے، ایک ہی ہوا لگتی ہے، ایک ہی سورج کی شعاعیں سب پر پڑتی ہیں۔ اس کے باوجود اُن کی ظاہری شکل وصورت کے علاوہ اُن کے ذائقوں میں بھی کتنا فرق ہے —— کیا یہ فرق، یہ چھوٹائی بڑائی، اور یہ اونچ نیچ آپ سے ہے، کسی ارادہ اور قُدرت کے عمل کے بغیر یہ یوں ہی خود بخود ہو رہا ہے؟ ہرگز نہیں! قطعاتِ زمین کے اس کیفیاتی فرق واختلاف میں، اور اس کی پیداوار کی اس رنگارنگی میں عقل وبصیرت سے کام لینے والے کیلئے کھُلی نشانیاں موجود ہیں جن سے وہ اصل حقیقت کے بارہ میں یقین حاصل کرسکتے ہیں۔ اور جس کی حکمت وقدرت سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے اُس کو جان سکتے ہیں —— اور سورہ عبس میں ارشاد ہے:۔

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا فَأَنبَتْنَا فِيهَا حَبًّا وَعِنَبًا وَقَضْبًا وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا وَحَدَائِقَ غُلْبًا وَفَاكِهَةً وَأَبًّا (سورہ عبس)	انسان ذرا اپنی غذا پر نظر ڈالے اور اُس میں غور کرے، ہم پہلے زمین پر پانی برساتے ہیں، پھر اُس زمین کی سطح کو شق کرتے ہیں پھر ہم اُس میں غلّہ، انگور، ترکاریاں، زیتون، کھجور کے درخت اور گنجان باغ اور میوے اور جانوروں کیلئے چارہ پیدا کرتے ہیں۔

پس ہماری پیدا کی ہوئی اِن غذاؤں کو استعمال کرنیوالے انسان کو چاہیئے کہ وہ سوچے کہ یہ غلّہ جس سے تیار کی ہوئی روٹی میں کھاتا ہوں اور یہ طرح طرح کے میوے اور یہ پھل اور ہمارے جانوروں کے کام آنے والے یہ چارے، یہ سب چیزیں کہاں سے آتی ہیں اور کون ان کو پیدا کرتا ہے، جس پانی سے یہ سب چیزیں پیدا ہوتی ہیں وہ کون برساتا ہے اور پھر کس کے حکم اور کس کی قدرت سے زمین کے اندر دبے ہوئے دانوں یا گٹھلیوں سے اِن چیزوں کے پودے اُگتے ہیں، اور بالکل ابتدا میں زمین میں سے اِن پودوں کے نکلنے کے لئے کون سطح زمین کو ان کے واسطے چیر دیتا ہے ـــــ تو انسان اگر حقیقت کا طالب بن کر اپنی غذا ہی پر غور کرے گا تو حقیقت کو پالے گا اور غذا کے خالق کا، اور اُس کی قدرت و حکمت کا اس کو علم حاصل ہو جائے گا ـــــ اور سورۂ نحل میں ارشاد ہے :ـــ

وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِىْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ـــــ (سورۂ نحل ـ ع ـ ۹)	اور تمہارے لئے تمہارے مویشیوں میں بھی غور و عبرت کا سامان ہے، ہم تم کو اُن کے پیٹ میں سے خون اور غلیظ گوبر کے درمیان سے پاک صاف دُودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کیلئے بڑا خوشگوار ہوتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ جن مویشیوں کا تم دُودھ پیتے ہو ذرا اُن ہی میں تم غور کرو، اُن کے پیٹ میں خون کی نالیاں ہیں، غلیظ فضلہ کے رہنے کی جگہ اور اُس کے راستے ہیں، اور کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوتا کہ ان مویشیوں کے جسم میں سُرخ ناپاک خون اور بدبودار غلیظ فضلہ کی کافی مقدار بھری نہ رہتی ہو، لیکن ان مویشیوں کے جسم کے جن حصّوں میں خون اور فضلات بھری رہتی ہے اُسی کے قریب سے لطیف اور صاف دُودھ نکلتا ہے جس میں نہ خون کے رنگ کا کوئی شائبہ ہوتا ہے، اور نہ غلیظ فضلہ کی بدبو کا کوئی اثر، وہ پینے والوں کیلئے

کیسا خوشگوار، خوشذائقہ اور نفیس مشروب ہے، تم خود اس کو جانتے ہو ——— ! تو ذرا سوچو، کہ یہ کس کی کاریگری ہے، کیا جس گائے یا بھینس میں سے یہ دُودھ نکلتا ہے یہ اُس کا فعل ہے؟ کیا کوئی انسانی عقل دُودھ کی یہ عجیب وغریب مشین بنا سکتا ہے کہ اس میں گھاس ڈال ڈال کر اس سے دُودھ نکالتا رہے، ہرگز نہیں ! ———

اور ایک موقع پر سوالیہ انداز میں "خدا کی ہستی" ہی کے متعلّق نہایت مختصر لفظوں میں کتنی بلیغ بات کہی گئی ہے، ارشاد ہے :———

اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (سورۂ ابراہیم - ع ۲)	کیا تمہیں اُس اللہ کی ہستی میں شک ہے جو تمام آسمان وزمین (اور ساری کائنات) کا بنانے والا ہے———

اس مختصر سے سوالیہ جملہ کے ذریعہ قرآن پاک نے انسانوں کے غور وفکر کیلئے اُن کے سامنے زمین وآسمان کی ساری وُسعتیں رکھ دی ہیں ——— آنکھوں والا انسان آسمان کو دیکھتا ہے، چاند سورج ستاروں کو دیکھتا ہے، اُن کی روشنی اور اُن کی گرمی یا خنکی کو دیکھتا ہے، زمین کو اپنے نیچے پاتا ہے، اس میں باغات دیکھتا ہے، کھیتیاں دیکھتا ہے اُس سے پیدا ہونے والی بے شمار چیزوں کو استعمال کرتا ہے اور اُن کے عجیب وغریب خواص اور منافع سے فائدہ اُٹھاتا ہے ——— پھر جب تک کہ اس کی عقل بالکل مسخ نہ ہو جائے وہ یہ نہیں سوچ سکتا کہ یہ سب چیزیں خود اپنے ارادہ اور فیصلہ سے ایسی بن گئی ہیں، وہ یہ بھی نہیں سوچ سکتا کہ کسی فلسفہ یا صنّاع انسان کی فلسفہ دانی یا کاریگری کے یہ سب کرشمے ہیں، اُس کی سلیم عقل وبصیرت اس کے سوا کسی توجیہ کو قبول ہی نہیں کر سکتی، کہ یہ سب کسی حکیم وخبیر ہستی کی قدرت اور صنعت کا کرشمہ ہے ———

اور سُورۂ ذاریٰت میں ارشاد ہے :———

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ط
(ذاریٰت - ع-۱)

(ترجمہ) اور یقین لانے والوں کے لئے زمین میں بہت سی نشانیاں موجود ہیں، اور خود تمہارے اندر بھی نشانیاں موجود ہیں، پھر کیا تم کو دکھلائی نہیں دیتا!

یہاں انسانوں سے کہا گیا ہے کہ زمین و آسمان میں ہماری قدرت کی جو نشانیاں ہیں ان کے علاوہ خود تمہارے وجود میں ہماری نشانیاں موجود ہیں، تم اگر اپنی بصیرت سے کام لو، تو اپنے وجود اور اپنے نظامِ زندگی میں غور کر کے یقین حاصل کر سکتے ہو ——

واقعہ یہ ہے کہ انسان اگر صرف اپنے وجود، اپنے اعضاء اور اپنے نظامِ زندگی ہی پر غور کرے تو فاطرِ ہستی کے بارہ میں اُسے ہرگز کوئی شک شبہ نہ رہے، وہ اپنی ابتداء کو سوچے، رحمِ مادر میں میری یہ صورت کس نے بنائی —— ؟ میرے قالب میں یہ رُوح کہاں سے آئی ہے —— ؟ میری زندگی کے یہ سامان کس نے پیدا کئے ؟ میری آنکھ میں روشنی کس نے ڈالی —— ؟ میرے کان کے پردوں میں آوازیں سُننے کی قابلیت کس نے رکھدی —— ؟ میری ناک کے غدودوں کو خوشبو اور بدبُو کا یہ احساس کس نے دیا —— ؟ میری زبان اور میری تالُو میں یہ چٹخارہ اور ذائقہ کس نے رکھ دیا، جس سے کھانے پینے کے سارے لُطف ہیں —— ؟ اور مجھے یہ گویائی کی قوّت کس نے دی ؟ —— کیا میرے ساتھ یہ مہربانیاں میری ماں نے کیں، میرے باپ نے کیں —— ؟ کیا میرے ان کاموں کیلئے کسی ڈاکٹر کی خدمات حاصل کی گئیں —— ؟ کیا میں نے خود اپنے آپ کو ایسا بنا لیا —— ؟ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے، اور یہ سوچنا تو اور بھی زیادہ غلط ہوگا کہ میں اپنے یا کسی اور کے ارادہ کے بغیر ہی آپ سے آپ ایسا بن گیا ——

پس! حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک بڑی حکیم و خبیر اور بڑی کامل القُدرت ہستی نے مجھے پیدا کیا ہے، اور یہ سب مہربانیاں میرے ساتھ اُسی نے، اور صرف اُسی نے کی ہیں —— فتبارك الله احسن الخالقين۔

(از: مولانا محمد منظور لکھنوی)

توحید کا قرآنی تصوّر

مولانا آزادؒ اپنی تفسیر "اُمّ الکتاب" میں لکھتے ہیں :۔۔۔۔۔

تجسیم اور تنزیہہ کے لحاظ سے قرآن کا تصوّر تنزیہہ کی ایسی تکمیل ہے جس کی کوئی نمود اس وقت دُنیا میں موجود نہیں تھی۔ قرآن سے پہلے تنزیہہ کا بڑے سے بڑا مرتبہ جس کا ذہن انسانی متحمّل ہوسکا تھا یہ تھا کہ اصنام پرستی کی جگہ ایک ان دیکھے خدا کی پرستش کی جائے لیکن جہاں تک صفاتِ الٰہی کا تعلق ہے انسانی اوصاف و جذبات کی مشابہت اور جسم و ہیئت کے تمثیل سے کوئی تصوّر بھی خالی نہ تھا، ہندوستان اور یونان کا یہی حال تھا۔ یہودی تصوّر جس نے اصنام پرستی کی کوئی شکل بھی جائز نہیں رکھی تھی وہ بھی اس طرح کے تشبّہ و تمثیل سے یکسر آلودہ ہے ۔۔۔۔۔

خدا کا حضرت یعقوبؑ سے کُشتی لڑنا، کوہِ طور پر شعلوں کے اندر نمودار ہونا حضرت موسیٰؑ کا خدا کو پیچھے سے دیکھنا، خُدا کا جوشِ غضب میں آکر کوئی کام کر بیٹھنا اور پھر پچھتانا، بنی اسرائیل کو اپنی چہیتی بیوی بنالینا اور اُس کی بدچلنی پر ماتم کرنا۔ ہیکل کی تباہی پر اُس کا نوحہ، اُس کی انتڑیوں میں درد کا اُٹھنا اور کلیجے میں سوراخ پڑجانا ۔۔۔۔۔

اَللّٰہ کے بارے میں یہودیوں کی توریت میں یہی تصوّرات بیان کئے گئے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ قرآن سے پہلے فہمِ انسانی اس درجہ بلند نہیں ہوئی تھی کہ تمثیل کا پردہ ہٹا کر صفاتِ الٰہی کا جلوہ دیکھ لیتا، اس لئے ہر تصوّر کی بُنیاد تمام تر تمثیل و تشبیہہ ہی پر

رکھنی پڑی، مثلاً توریت میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف زبور کے ترانوں اور یشعیا کی کتاب میں خدا کے لئے شائستہ صفات کا تخیّل موجود ہے لیکن دوسری طرف خدا کا مخاطبہ ایسا نہیں ہوتا جو سراسر انسانی اوصاف وجذبات کی تشبیہ سے مملو نہ ہو —

لیکن ان تمام تصوّرات کے بعد جب ہم قرآن کی طرف رُخ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اچانک فکر وتصوّر کی ایک نئی دُنیا سامنے آگئی۔ یہاں تمثیل وتشبیہ کے تمام پردے بیک دفعہ اُٹھ جاتے ہیں —

انسانی اوصاف وجذبات کی مشابہت مفقود ہوجاتی ہے۔ ہر گوشہ میں حقیقت کا جلوہ نمایاں ہوجاتا ہے اور تجسّم کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا۔ تنزیہہ کمال کے اس مرتبہ تک پہنچ جاتی ہے کہ :—

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ● (القرآن)	اُس کے مثل کوئی شے نہیں کسی چیز سے بھی تم اسے مشابہ نہیں ٹھہرا سکتے انسان کی نگاہیں اُسے نہیں پا سکتیں لیکن وہ انسان کی نگاہوں کو دیکھ رہا ہے —
قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ٥ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ٥ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ	اللہ کی ذات یگانہ ہے، بے نیاز ہے اسے کسی سے احتیاج نہیں۔ نہ تو اُس سے کوئی پیدا ہُوا، اور نہ وہ کسی سے پیدا ہُوا۔ اور نہ کوئی ہستی اُس کے درجہ میں برابری کر سکتی ہے —

توریت اور قرآن کے جو مقام مُشترک ہیں دقّتِ نظر کے ساتھ ان کا مطالعہ کرو، توریت میں جہاں کہیں خدا کی براہِ راست نمود کا ذکر کیا گیا ہے قرآن وہاں خُدا کی صفت کا ذکر کرتا ہے۔ توریت میں جہاں یہ پاؤ گے کہ خدا متشکل ہو کر اُترا۔ قرآن اس موقع کی یوں تعبیر کرے گا۔

کہ خدا کا فرشتہ متشکل ہو کر نمودار ہوا

البتہ یاد رہے کہ تنزیہہ اور تعطیل میں فرق ہے۔ تنزیہہ سے مقصود یہ ہے کہ جہاں تک بشری عقل کی رسائی ہے، صفاتِ الٰہی کو مخلوقات کی مشابہت سے پاک اور بلند رکھا جائے، تعطیل کے معنی یہ ہیں کہ تنزیہہ کے منعی ونفی کو اس حد تک پہنچا دیا جائے کہ فکرِ انسانی کے تصوّر کے لئے کوئی بات ہی باقی نہ رہے۔ (ہنود کے فلسفہ میں بلا شبہ اوپنشد تنزیہہ کی "نیتی نیتی" کو بہت دُور تک لے گئے۔ لیکن عملاً نتیجہ کیا نکلا؟ یہی نا کہ ذاتِ مطلق (برہما) کو ذاتِ مشخّص (ایشور) میں اُتارے بغیر کام نہ چل سکا

ع بنتی نہیں ہے بادۂ وساغر کہے بغیر

جس طرح اثباتِ صفات میں غلو تشبہّ کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی طرح نفیِ صفات میں غلو تعطیل تک پہنچا دیتا ہے۔ اور یہ دونوں تصوّرِ انسانی کے لئے ٹھوکر کا باعث بن گئے۔ اگر تشبہّ اسے حقیقت سے ناآشنا کر دیتا ہے تو تعطّل اسے عقیدہ کی رُوح سے محروم کر دیتا ہے پس ضروری ہُوا کہ افراط و تفریط دونوں سے قدم روکے جائیں اور تشبہ اور تعطیل دونوں کے درمیان راہ نکالی جائے، چنانچہ قرآن نے جو راہ اختیار کی ہے وہ دونوں کے راہوں کے درمیان جاتی ہے اور دونوں انتہائی سمتوں کے میلان سے بچتی ہوئی نکل گئی ہے

اگر خدا کے تصوّر کے لئے صفات و افعال کی کوئی صورت ایسی باقی نہ رہے جو فکرِ انسانی کی گرفت میں آسکتی ہے تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ یہی نکلے گا کہ تنزیہہ کے معنی نفی وجود کے ہو جائیں گے یعنی اگر کہا جائے کہ ہم خدا کے لئے کوئی ایجابی صفت قرار نہیں دے سکتے، کیونکہ جو صفت بھی قرار دیں گے اس میں مخلوق کے اوصاف سے مشابہت کی جھلک آجائے گی تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں فکرِ انسانی کے لئے کوئی سر رشتہ تصوّر باقی نہیں رہے گا اور وہ کسی ایسی ذات کا تصوّر ہی نہیں کر سکے گا۔ اور جب تصوّر نہیں کر سکے گا تو ایسا عقیدہ اس کے اندر کوئی گرفت اور لگاؤ بھی پیدا نہیں کر سکے گا۔ ایسا تصوّر اگرچہ اثباتِ وجود کی کوشش بھی کرے،

لیکن فی الحقیقت وہ نفی کا وجود کا تصوّر ہوگا، کیونکہ صرف سلبی تصوّر کے ذریعہ ہم ہستی کو نیستی سے جُدا نہیں کرسکتے ——

غیر صفاتی تصوّر محض نفی وسلب ہوتا ہے۔ اور اس سے انسانی طلب کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ ایسا تصوّر ایک فلسفیانہ تخیّل ضرور پیدا کرے گا، لیکن دلوں کا زندہ اور سرگرم عقیدہ نہیں بن سکے گا، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جو راہ اختیار کی وہ ایک طرف تو تنزیہہ کو اُس کے کمال درجہ پر پہنچا دیتی ہے دوسری طرف تعطیل سے بھی تصور کو بچا لے جاتی ہے وہ فرداً فرداً تمام صفات وافعال کا اثبات کرتا ہے مگر ساتھ ہی مشابہت کی قطعی نفی بھی کر جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے خدا حُسن وخوبی کی ان تمام صفتوں سے جو انسانی فکر میں آسکتی ہے متّصف ہے وہ زندہ ہے، قُدرت والا ہے، پالنے والا ہے، رحمت والا ہے دیکھنے والا ہے، سُننے والا، سب کچھ جاننے والا اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ انسان کی بول چال میں قُدرت و اختیار اور ارادہ وفعل کی جتنی شائستہ تعبیرات ہیں، اُنہیں بھی بلا تامّل استعمال کرتا ہے —— لیکن یہ بھی صاف صاف اور بے لچک لفظوں میں کہہ دیتا ہے کہ اس سے مشابہ کوئی چیز نہیں جو تمہارے تصوّر میں آسکتی ہے (۱) وہ عدیم المثال ہے۔ لیس کمثلہ شئی (۲) تمہاری نگاہ اُسے پا ہی نہیں سکتی لا تدرکہ الابصار (۳) تم اُس کے لئے اپنے تخیّل سے مثالیں نہ گھڑو۔ فلا تضربوا للہ الامثال پس ظاہر ہے کہ اُس کا زندہ ہونا ہمارے زندہ ہونے کی طرح نہیں ہو سکتا، اُس کی پروردگاری ہماری پروردگاری کی طرح نہیں ہو سکتی، اُس کا دیکھنا، سُننا اور جاننا ویسا نہیں ہو سکتا، جس طرح کے دیکھنے سُننے اور جاننے کا ہم تصوّر کرسکتے ہیں، اُس کی قدرت و بخشش کا ہاتھ اور جلال و احاطہ کا عرش ضرور ہے لیکن یقیناً اُس کا مطلب وہ نہیں ہو سکتا، جو ان الفاظ کے مدلولات ہمارے ذہن میں متشکل ہونے لگتے ہیں ——

قرآن نے اپنے مطالب کی دو بنیادی قسمیں قرار دیں۔ ایک کو "محکمات" سے

تعبیر کیا ہے۔ دوسری کو "متشابہات" سے محکمات سے وہ آیتیں مقصود ہیں جو صاف صاف انسان کی سمجھ میں آسکتی ہیں اور اُس کی عملی زندگی سے تعلّق رکھتی ہیں اور اس کیلئے ایک سے زیادہ معانی کا ان میں احتمال نہیں۔ متشابہات وہ ہیں جن کی حقیقت وہ پا نہیں سکتا اور اُس کے سوا چارہ نہیں کہ ایک خاص حدتک جاکر رُک جائے اور بے نتیجہ باریک بینیاں نہ کرے ــــ

صفاتِ الٰہی کی حقیقت متشابہات میں داخل ہے۔ اس لئے قرآن کہتا ہے کہ اس باب میں فکری کاوشیں کچھ سُودمند نہیں ہوسکتیں بلکہ طرح طرح کی کج اندیشیوں کا دروازہ کھول دیتی ہیں۔ یہاں بجز تفویض کے چارہ کار نہیں ــــ

(تفسیر سُورۃ الفاتحہ ۲۱۹)

قرآن میں شرکیہ تصوّرات کا حتمی اِنسداد "

جہاں تک توحید اور شرک کا تعلّق ہے۔ قرآن کا تصوّر اس درجہ کامل اور بے لچک ہے کہ اُس کی کوئی نظیر پچھلے تصوّرات میں نہیں مل سکتی۔ اگر خدا اپنی ذات میں یگانہ ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنی صفات میں بھی یگانہ ہو کیونکہ اُس کی یگانگت کی عظمت قائم نہیں اگر کوئی دوسری ہستی اُس کی ذات میں شریک وسہیم مان لی جائے ــــ

ایجابی پہلو یہ ہے کہ خدا ایک ہے اور سلبی یہ ہے کہ اُس کی مانند کوئی نہیں اور جب اُس کی مانند کوئی نہیں تو ضروری ہے کہ جو صفتیں اس کے لئے مخصوص ہیں ان میں کوئی دوسری ہستی شریک نہ ہو، پہلی بات کہ توحید فی الصفات کی نزاکتوں اور بندشوں کی متحمّل

ہوسکتی، اس لئے اِن مذاہب نے تمام تر زور توحید فی الذّات ہی پر دیا۔ توحید فی الصفات اپنی ابتدائی اور سادہ حالت میں چھوڑ دی گئی ——

لیکن قرآن نے توحید فی الصّفات کا ایسا نقشہ کھینچ دیا کہ اس طرح کی لغزشوں کے تمام دَروازے بند ہو گئے، اُس نے صرف توحید ہی پر زور نہیں دیا بلکہ شرک کی راہیں بھی بند کر دیں اور یہی اس باب میں اُس کی خصوصیّت ہے ——

وہ کہتا ہے ہر طرح کی عبادت اور نیاز کی مستحق صرف خدا ہی ذات ہے۔ پس اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے ساتھ سر جُھکایا تو توحید الٰہی کا اعتقاد باقی نہ رہا۔ وہ کہتا ہے یہ اُس کی ذات ہے جو انسانوں کی پُکار سُنتی اور اُن کی دُعائیں قبول کرتی ہے۔ پس اگر تم نے اپنی دُعاؤں اور طلب گاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو خدا کے رشتۂ معبودیت کی یگانگی باقی نہ رہی۔ اس طرح عظمتوں، کبریائیوں، کارسازیوں اور بے نیازیوں کا جو اعتقاد تمہارے اندر خدا کی ہستی کا تصوّر پیدا کرتا ہے وہ صرف خدا ہی کے لئے مخصوص ہونا چاہیئے۔ اگر تم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لئے بھی پیدا کر لیا تو تم نے اُسے خُدا کا نِدّ یعنی شریک ٹھہرا لیا اور توحید کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا ——

یہی وجہ ہے کہ سورۂ فاتحہ میں "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" کی تلقین کی گئی اس میں اوّل تو عبادت کے ساتھ استعانت کا بھی ذکر کیا گیا، پھر دونوں جگہ مفعول کو بھی مقدّم کیا جو مفیدِ حصر ہے یعنی "صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں" ——

اُس کے علاوہ تمام قرآن میں اس کثرت کے ساتھ توحید فی الصفات اور ردِّ اشراک پر زور دیا گیا ہے شاید ہی کوئی سورت بلکہ کوئی صفحہ اس سے خالی ہو ——

مقامِ نبوّت کی حد بندی

سب سے زیادہ اہم مسئلہ مقامِ نبوّت کی حد بندی کا تھا یعنی نبی کی شخصیّت کو اس کی اصلی جگہ میں محدود کر دینا تاکہ شخصیّت پرستی کا ہمیشہ کے لئے سدِّباب ہو جائے، اس بارے میں قرآن نے جس طرح صاف اور قطعی لفظوں میں جا بجا پیغمبرِ اسلامؐ کی بشریت اور عبدیّت پر زور دیا ہے محتاجِ بیان نہیں، ہم یہاں صرف ایک بات کی طرف توجہ دلائیں گے اسلام نے اپنی تعلیم کا بُنیادی کلمہ جو قرار دیا ہے وہ سب کو معلوم ہے —

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ —	یعنی میں اقرار کرتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اقرار کرتا ہوں کہ محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم)

اللہ کے بندے اور اُس کے رسُول ہیں —

اس اقرار میں جس طرح خدا کی تعریف کا اعتراف کیا گیا ہے، ٹھیک اسی طرح پیغمبرِ اسلام (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی عبدیت اور درجۂ رسالت کا بھی اعتراف ہے۔ غور کرنا چاہیئے کہ ایسا کیوں کیا گیا، صرف اس لئے کہ پیغمبرِ اسلام کی عبدیّت اور درجہ رسالت کا اعتقاد اسلام کی اصل و اساس بن جائے اور اس کا کوئی موقع ہی باقی نہ رہے کہ عبدیّت کی جگہ معبودیت اور رسالت کی جگہ اوتار کا تخیّل پیدا ہو —

ظاہر کہ اس سے زیادہ اس معاملہ کا تحفّظ کیا جا سکتا تھا ؟

کوئی شخص دائرۂ اسلام میں داخل ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خدا کی توحید کی پیغمبرِ اسلامؐ کی عبدیّت کا بھی اقرار نہ کر لے — یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبرِ اسلام کی وفات کے بعد مسلمانوں میں بہت سے اختلافات پیدا ہوئے لیکن اُن کی شخصیّت

کے بارے میں کبھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوا۔ ابھی اُن کی وفات پر چند گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، نے بر سرِ منبر اعلان کر دیا تھا ـــــــ

من کان منکم یعبد محمداً	جو کوئی تم میں محمدؐ کی پرستش
فان محمداً قد مات	کرتا تھا سو اُسے معلوم ہو جانا چاہیے
ومن کان منکم یعبد اللہ	کہ محمدؐ نے وفات پائی اور جو کوئی
فان اللہ حیّ لا یموت	تم میں سے اَللہ کی پرستش کرتا تھا
ـــــــ (بخاری)	تو اُسے معلوم ہو جانا چاہیئے کہ اللہ

کی ذات ہمیشہ زندہ ہے اور اس کے لئے موت نہیں ـــــــ

(تفسیر سورۃ الفاتحہ ص۲۳۱)

توحید کے

قرآنی براہین

مفکرِ اسلام عباس محمود العقاد اپنی کتاب "اللہ" میں لکھتے ہیں :۔

اللہ تعالیٰ کے وجود کو ثابت کرنیوالے دلائل آسمانی کتابوں میں سے کسی کتاب میں بھی اس قدر تکرار کے ساتھ نہیں آئے جس قدر قرآنِ کریم میں بیان کئے گئے ہیں ——

منکرینِ وجودِ الٰہی کے مقابلہ میں اس قدر اشارے نہ تورات میں ملتے ہیں نہ انجیل میں۔ کیونکہ انبیائے تورات کے سامنے تمام تر وہ لوگ تھے جو بنی اسرائیل کے معبود پر ایمان رکھتے تھے اور وہ اس کے وجود کے منکر نہ تھے، اس لئے انبیاء کی تعلیم کا روئے سخن یہ نہ تھا کہ وہ کسی منکر یا متردد گروہ کو خدا کے وجود پر مطمئن کریں۔ بلکہ ان کی تبلیغ کا روئے سخن صرف اس قدر تھا کہ وہ قوم کو خدا کی ناراضی سے ڈراتے اور غیر اللہ پر ایمان لانے کے بُرے انجام سے خوف دلاتے اور خدائی وعدہ وعید کو یاد دلاتے ——

کیونکہ بنی اسرائیل "یاھواہ" کو اپنا ہی معبود سمجھتے تھے اور اس میں کسی غیر کی شرکت کو پسند نہ کرتے تھے۔ نہ اس معبود کے ساتھ وہ کسی اور معبود کی شرکت گوارا کرتے تھے وہ پرانے زمانے سے معبود پرستی کا یہی تخیّل قائم کرتے ہوئے چلے آرہے تھے یہ اس وقت کا ذکر ہے جب کہ وہ متعدد معبودوں پر ایمان رکھتے تھے اور توحید میں خالص اعتقاد نہ رکھتے تھے ——

بات اصل میں یہ تھی کہ " یاھوا " کے عبادت گزار نہ یاھوا کے وجود کے منکر تھے اور نہ اس کے علاوہ دیگر کسی معبود کے وجود کا انکار کرتے تھے، البتہ ان کا یہ وجود دیگر معبودوں پر فضیلت رکھتا تھا، جیسا کہ وہ خود بھی دیگر قبائل کے مقابلہ میں فضیلت و شرف کے مالک سمجھے جاتے تھے ـــــ

دوسرے معبود ان کے خیال میں اسی طرح موجود تھے جس طرح ان کا معبود "یاھواہ" موجود تھا لیکن وہ ان کے خیال میں عبادت کے مستحق نہ تھے کیونکہ وہ دشمنوں کے معبود سمجھے جاتے تھے۔ ان معبودوں کی پرستش بنی اسرائیل کے خیال میں ایک بڑی خیانت تھی کفر نہ تھا جیسا کہ بعد میں آنے والے لوگوں نے سمجھا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ان کے نزدیک اجنبی معبودوں کی پرستش ایسی ہی قبیح تھی جیسی کہ کسی اجنبی بادشاہ کی وفاداری۔ ایک قسم کی قومی غداری اور خیانت متصوّر کی جاتی ہے ـــــ

اسی لئے انبیائے تورات یاھوا ' یا دیگر معبودوں کو ثابت کرنے میں مصروف نہ رہتے تھے بلکہ ان کا زیادہ تر شغل یہ تھا کہ لوگ یاھواہ کی غیرت و ناراضی سے ڈریں۔ اور اس کے انتقام و عذاب سے اپنی قوم کو بچائیں۔ یاھواہ کا عذاب اس وقت کہیں زیادہ سخت ہو جاتا تھا جب بنی اسرائیل مصر، بابل یا کنعان کے معبودوں میں سے کسی معبود کی پرستش کی طرف مائل ہو جاتے تھے ـــــ

مسیحیّت کا ظہور ہوا تو اس مذہب اور دیگر اسرائیلی مذاہب میں وجودِ الٰہی یا انبیائے تورات کے سلسلہ میں کوئی اختلاف نہ تھا بلکہ زیادہ تر ربّیوں اور کاہنوں کا باہمی اختلاف تھا کیونکہ وہ عبادت کے مظاہر اور شعائرِ مقدسہ میں جکڑ بند کر کے اموال و سلطنت حاصل کرنا چاہتے تھے اور دنیوی منافع کو ایمانی فرائض پر فوقیت دیتے تھے

مسیحی مبلّغوں کو ربوبیّت کے نظریہ میں اخلاص کی اشاعت کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب کہ ان کی تبلیغ کا دائرہ اس وقت کی بڑی بڑی سلطنتوں یعنی

رُوم وغیرہ میں وسیع ہُوا۔ یہ زمانہ انجیلوں کی کتابت کے کُچھ ہی بعد کا زمانہ ہے ـــــ
یہی وجہ ہے کہ تورات و انجیل کے صحیفوں میں وجودِ الٰہی کے اثبات پر براہین کا تکرار و اعادہ نہیں ہے۔ چونکہ قرآن کا خطاب منکرین، مشرکین، یہود، عیسائی اور ربوبیت و عبادت کے بارے میں اختلاف کرنیوالوں سے تھا اور اپنے زمانۂ نزول میں بستے والی تمام اقوام، قبائلِ عرب اور تمام اُمّتوں سے تھا، اسی لیے اُسے اپنے ہر خطاب میں ربوبیت کا ایک واضح تصوّر پیش کرنا پڑا۔ اسی کی دعوتِ حکیمانہ فراست و عقل کے ساتھ عبادت سکھاتی ہے اور ایک معبود اور ان دیگر معبودوں میں تفریق کرتی ہے جو اس وقت بے دلیل معبود بنے ہوئے تھے ـــــ

قرآن نے جن لوگوں کو خطاب کیا ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو وجودِ الٰہی کا انکار کرتے تھے اور ان میں کچھ لوگ وہ بھی تھے جو بُت پرستی یا ثنویت کا عقیدہ رکھتے تھے اور آباؤ اجداد سے وراثت میں یہی عقیدہ انہیں مِلا تھا ـــــ

کُچھ لوگ وحدانیت کے نظریہ میں ثنویت کی آمیزش کرتے تھے اور کتبِ منزّلہ کی تشریحات میں لڑتے جھگڑتے تھے جیسے کہ یہود و مسیحی گروہ ـــــ

قرآن، عقل کو خطاب کرتا ہے تاکہ اس کی مخالفت کرنے والوں کو جس کو انسانی عقلیں قبول کرتی ہیں اطمینان و سکون کی دُنیا عطا کرے ـــــ

قرآنِ کریم میں صرف یہی دلائل نہیں بلکہ بہت سی مثالیں موجود ہیں اور مختلف نوعیت سے ان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان آیات میں بہت اہم دلائل بھی بیان کئے گئے ہیں بہت سے حکمانے وجودِ الٰہی کے اثبات پر اُن سے کافی فائدہ اُٹھایا ہے، اُن دلائل کے نام یہ ہیں، براہینِ تخلیق و ایجاد، براہینِ قصد و نظام، براہینِ کمال و استعلا، اور مثلِ اعلیٰ ـــــ قرآن میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے جو دلائل اُس نے خاص طور پر بیان کئے اور تاکید و توضیح کے ساتھ انہیں مخصوص کیا، ان میں قناعت کننے

والی دلیل اور اندھے مادّہ پر کائنات کے وجود کو قائم کرنے والوں کے قول کو پارہ پارہ کر دینے والی پہلی دلیل ظہورِ حیات کی برہان ہے۔ یعنی مادّہ میں کس طرح جان پڑی۔؟ قرآن کہتا ہے "، اللہ تعالیٰ بے جان سے جاندار پیدا کرتا ہے ...." اللہ تعالیٰ ہی نے تمہارے کان آنکھیں اور دل پیدا کئے"..... ——

دوسری دلیل برہانِ تناسل ہے۔ یعنی بقائے حیات کو دوام بخشنے کے لئے جانداروں میں اُس نے سلسلۂ تناسل قائم کیا۔ چنانچہ تمہارے ہی نفوس میں تمہارے لئے جوڑے پیدا کئے ——

ظہورِ حیات کے مسئلہ میں مادیین بے بس نظر آتے ہیں۔ بے جان مادّہ میں ظہورِ حیات کی وہ کوئی توجیہ نہیں کر سکے، بجز اس کے کہ جو دعویٰ ہے وہی دلیل ہے یا پھر اٹکل سے رجماً بالغیب بے دلیل باتوں میں مخبوط الحواس نظر آتے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر تو ان کا ایمان نہیں۔ غیب کی وہ تصدیق نہیں کرتے اور مشاہدہ یا جو مشاہدہ میں داخل ہے یعنی لمس وغیرہ کے سوا وہ کسی چیز پر اعتماد نہیں کرتے، اس لئے وہ ظہورِ حیات کا کوئی جواب نہیں دے سکتے ——

مادّہ میں ظہورِ حیات کی بعض نے یہ تشریح کی ہے کہ مادّہ میں باہمی ترکیب و آویزش کے بعد جان پڑنے کی صلاحیت موجود ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ کوئی تشریح نہیں.... بلکہ ایسا ہے جیسے ایک محسوس واقعہ کی کسی محسوس واقعہ سے تشریح کر دی جائے —— بعض عالموں جیسے لارڈ کلفن کی رائے ہے کہ حیات کے جراثیم اس کرۂ ارض پر فضا میں منتشر شہابی شعلوں کی صورت میں منتقل ہو گئے۔ لیکن اس پر یہ اعتراض بحالہٖ قائم رہتا ہے کہ ان جراثیم کے کرۂ ارضی کی طرف منتقل ہونے اور ظہورِ حیات کے نوبت آنے کی کیا وجہ تھی، حالانکہ اس بے جان مادّہ میں حیات کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

حاصل یہ ہے کہ ظہورِ حیات کے مسئلہ میں دو قولوں میں سے ایک قول اختیار کرنے کے سوا

چارہ نہیں یا تو یہ کہا جائے کہ خود مادّہ میں اس قسم کی صلاحیت موجود ہے، لہٰذا کسی پیدا کرنے والے اور صاحب ارادہ کو ماننے ضرورت نہیں۔ اور یا یہ کہا جائے کہ یہ ایک صاحب ارادہ خالق کا فعل ہے جو اپنے ارادوں میں پوری قدرت رکھتا ہے

اگر یہ تمام عالم مادّہ ہی مادّہ ہے اس کے سوا اور کچھ موجود نہیں. تو اس سے لازم آتا ہے کہ مادّہ اَزلی اَبدی ہے جس کی نہ ابتدا، ہے نہ انتہا، وہ ازل سے اپنی کامل قوتوں اور جملہ خصوصیتوں کے ساتھ موجود ہے۔ وہ خصائص مادّہ کو لازم ہیں خواہ مادّہ فضا یا ارض میں موجود ہو یا اس کے علاوہ کہیں اور اپنا مقام رکھتا ہو ——

لیکن اس صورت میں اس بات کی توجیہ کرنا ہوگی کہ کُرّوں میں کس کُرّوں میں زندگی ہے اور کس کُرّے میں نہیں۔ زمانہ کی مسلسل رفتار میں بھی یہی صورت ہے کہ زمانہ کے بعض حصّوں میں زندگی تھی اور بعض میں نہیں تھی، جب حیات کی صلاحیتیں مادّہ میں موجود تھیں تو وہ صلاحیتیں کروڑوں سال سے کیوں بروئے کار نہیں آئیں بلکہ سالوں کا جواب کروڑوں سے بھی اُوپر ہے۔ پھر ایک زمانہ جو چند ہزار سال میں محدود ہے ایسا آتا ہے کہ ایک معیّنہ تاریخ میں حیات کا ظہور ہو جاتا ہے۔ اُس مسلسل اَزلی نظام میں اس معیّن تاریخ کا کیا جوڑ —— ؟ —— سوال یہاں اس اضطراری کیفیّت کا ہے جس میں کوئی اختیار موجود نہیں۔ اگر اس مسئلہ کو کسی صاحب اختیار کے ارادہ پر مبنی کیا جائے تو اس کی توجیہ آسان ہو جائے گی، کیونکہ خاص زمان و مکان میں یہ تدبیر و تخلیق ہوئی، کیونکہ تدبیر کا تعلّق اختیار و ارادہ سے ہوتا ہے ——

مادّہ میں اگر اَزل سے کچھ خصوصیات پنہاں تھیں تو ان کا عمل کیوں ازل ہی سے جاری نہیں ہوا؟ یہ ترکیبی خصوصیات زمانہ کی کیوں محتاج ہوئیں۔ حالانکہ زمانہ بھی مادّہ ہی کی فطرت سے وجود میں آیا ہے۔ جب سے وہ خصوصیات موجود ہیں مادّہ کی فطرت بھی انہیں لازم ہے۔ یہ ترکیب کیوں اس معیّن زمانہ کو مقتضی ہوئی۔ اور کیوں مادّہ کے

علاوہ کسی جز و میں اور فضا کے کسی محدود مکان کے علاوہ میں یہ ترکیبی تقاضے پورے نہیں ہوئے؟ مسئلہ ہزار سال، دس ہزار سال یا کروڑ، دس کروڑ یا ہزار کروڑ یا کروڑ ہا کروڑ کا نہیں بلکہ "ابد" کا ہے جس میں نہ عالم کی ابتدا ہے۔ نہ انتہا، نہ عقل کے لئے ٹھیرنے کا کوئی مقام، اس غیر محدود زمانہ میں یہ حیاتی خصوصیات کیوں محدود ہوئیں؟ اور کیوں یہ ترکیبی اجزاء زمان و مکان کے محدود حصّوں میں تقسیم ہوئے؟ حیات مادّہ سے کیوں ایک دم متصادم ہوگئی۔ اس میں جو تمام تدبیری صورتیں ممکن تھیں بے عقل مادّہ میں کیسے آگئیں؟

یہ بات عقل کے ذمہ ہے کہ وہ اِن ترجیحی اسبابِ حیات کو خالق وصاحبِ ارادہ کی صنعت قرار دے۔ لہذا اس آسان سے فرض کے مقابلے میں ایک غیر ممکن فرض کو کیوں ترجیح دی جائے ——

ہمارا یہ فریضہ نہایت سہل الفہم ہے کہ حیات کا ظہور صاحبِ ارادہ خالق کی طرف سے ہوا۔ اس خالق کے تمام یا بعض مقاصد اگر ہمیں معلوم نہ ہوں تو بھی عقل اس خالق کا انکار یا نفی نہیں کرتی، کیونکہ اس قدر جان لینا کافی ہے کہ صاحبِ ارادہ خالق اپنی غرض بھی جانتا تھا —— اس کے بعد یہ ضروری نہیں کہ عقل کو بھی اس کا علم ہو اور ہر عاقل اس پر احاطہ رکھتا ہو۔ یہ ہمارے شعور کے لئے ممکن نہیں کہ بے عقل اندھے مادّہ نے خاص زمان و مکان میں ظہورِ حیات کو ترجیح دی۔ نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شانِ حیات میں مادّہ کے قوانین اَزلی دَوریں کروڑ ہا کروڑ سالوں کے بعد یونہی جاری ہوا کرتے ہیں، ہاں یہ کہنا صاف اور سیدھی بات ہوگی کہ زمان و مکان کی یہ ترجیح ایک صاحبِ اختیار وارادہ کی جانب سے ہوئی۔ ساتھ ہی وہ جو کچھ اختیار کرتا اور ارادہ کرتا ہے اس کو جانتا بھی ہے۔ مسئلہ کی اس تشریح کے بعد حیات کے ظہور کے لئے زمان و مکان کی ترجیح کا کوئی سوال باقی نہیں رہ جاتا ——

—— لہذا بے جان مادّہ میں زندگی کی تخلیق —— یا میّت سے زندہ کا اخراج۔

قرآنِ کریم کی تاکید و توضیح کی روشنی میں ایک معجزہ ہے۔ اور لطیف دلائل کے ساتھ ایک لطیف ذات سے متعلق عقلوں میں حیرت انگیزی کا موجب ہے، کیونکہ مادّہ افلاک، مدار اور برجوں میں منظم بھی، مگر تنظیم مادّہ کے حالات میں ایک ایسی حالت ہے جو مادّہ کو پیش آسکتی ہے عقل کو کسی خارجی قوّت کے قائل ہونے کی ضرورت نہیں، لیکن یہ کہ مادّہ نے خود ہی اپنے کان اور دل پیدا کر لیئے، کسی طرح بھی عقلاً قابلِ قبول نہیں جب تک کہ اس کی تشریح نہ کی جائے اور یہ جو کہا گیا کہ زندہ جسم کی ترکیب قابلِ تعجّب نہیں کیونکہ ہم آلاتِ مادّیہ کو یہ دیکھتے ہیں کہ ایک معلوم مقصد کے لئے خاص نظام و عمل کے لئے حرکت کرتے ہیں، غلط ہے۔ ہمیں انتہائی تعجّب زندہ اجسام اور آلات کے درمیان تشابہ ماننے پر ہے کیونکہ آلاتِ صانع کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ اور اگر مادّہ کے اعمال کی توجیہ حرارت و حرکت سے کی بھی جائے تو بھی گویا ایک ایسے انجینئر کو ماننا ہوگا جو ان قوانین کو مسخّر کرنے والا ہو ——

لوگ ظاہری آنکھوں سے زندہ اجسام کے اعضاء کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس پر انتہائی تعجّب کرتے ہیں کہ وہ دقیق ہیں باہم ایک دوسرے کو سہارا دیئے ہوئے ہیں۔ ایک کا عمل دوسرے کے لئے معاون ہے۔ نشو و نما کے عمل کی رفتار عمر اور نوعیّت کے مطابق جاری ہے۔ انسان، حیوان، حشرات الارض اور نباتات تمام کے اجسام میں یہی کیفیّت ہے..... ان تعجّب کرنے والوں کو اس سے کہیں زیادہ تعجّب ان اعضاء کی اس ترکیب پر ہونا چاہیئے جو انہیں عمل تحلیل اور خورد بینوں سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوتی ہے۔ یہ وظائف کس طرح باہم ایک دوسرے کو سہارا دیئے ہوئے ہیں، ان کو معلوم ہوگا کہ آنکھوں سے نظر آنے والے یہ اعضاء ان لاکھوں ذرّات سے مرکّب ہیں جو آنکھوں سے دکھائی بھی نہیں دے سکتے۔ ہر ذرّہ جسم کے مناسب مقام پر ٹھیرا ہوا ہے اور ایک دوسرے کو اس طرح مدد دے رہا ہے گویا اسے دوسرے

ذرّات کی احتیاج وطلب معلوم ہے۔ ان میں سے اگر ایک ذرّہ بھی بیماری کی وجہ سے اپنے عمل سے بھٹکنے لگتا ہے تو دوسرے تمام ذرّات اس کی غلطی اور تعطّل کی اصلاح کرنے کے لئے سرگرم عمل ہو جاتے ہیں ——

۱۹۳۶ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کی سالانہ فزیالوجی کانفرنس میں خطبۂ صدارت دیتے ہوئے پروفیسر لیتھس نے کہا تھا کہ "پروٹین کا ہر خلیہ سینکڑوں حلقوں کے سلسلہ میں مربوط ہوتا ہے، پھر ان میں سے ہر حلقہ کچھ ایسے ذرّات سے مرکّب ہے جن کا قوام نوشادر کی تُرشی پر مبنی ہے۔ یہ ترشی ان میں تقریباً بیس فی صد ہوتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نسبت و ترتیب کے مطابق ان میں ہر ایک کا وقوع نہ ہو لیکن ہمارا مشاہدہ یہی ہے کہ ہر حلقہ کے نظام میں یہی ایک ترتیب و نظام موجود ہے۔ اس کے خلاف کوئی بھی نادر صورتِ حال موجود نہیں ——

سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس دقیق نظام میں کوئی غلطی پیش کر سکتے ہیں؟ قوّتِ خیال کی اس دقیق رسّی کے لئے یہ مثال کافی ہے کہ عام انسانی لغت میں ابجدی حروف کو سوچیں کہ یوں تو وہ تیس سے زائد نہیں مگر اپنی متغیّر ترکیبوں میں قوموں کے تمام کلمات وعبارات میں بولے جانے والے الفاظ میں وہ بے شمار ہیں۔ اسی طرح پروٹین کا خلیہ اپنے چھوٹے سے حجم میں ہزاروں خلیوں کو قبول کرتا ہے مگر ہمارا مشاہدہ ایک متغیّر ترتیب میں صرف ایک ہی لفظ کا سا ہے۔ اس سے آپ توفیق و ترکیب کی صلاح و درستی کا اندازہ لگا سکتے ہیں ——

اس خیال کو لیتھس نے ایک مثال سے واضح کیا تھا کہ کہکشاں کی روشنی کو ایک جانب سے دوسری جانب پہنچنے میں تین لاکھ سال لگتے ہیں۔ تو اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ خلیہ کی ترکیب کو ٹھیک نشانہ پر بیٹھنے میں ایک قابلِ فہم مثال سے تشبیہ دیں تو اس کی واضح تصویر یہ ہو سکتی ہے کہ زمین سے ایک گولی چلائی جائے جو کہکشاں کی نہر میں آنکھ کے

ایک معیّن ستارے کے نشانہ پر جا لگے، اسی طرح یکے بعد دیگرے برابر گولیاں چلیں اور کبھی اس نشانہ سے خطا نہ کریں۔ یہ نظریہ بھی اس مفروضہ پر قائم ہے۔
کہ خلیہ کے حلقے صرف پچاس ہیں، سینکڑوں نہیں ——

اگر یہ تمام نظام اتفاقی تصادم ہے اور اس میں خلق و تدبیر نافذ نہیں تو چاہیئے کہ عقل کی ڈکشنری سے قصد کے معنی حرفِ غلط کی طرح مٹا دیئے جائیں ——

اس تمام احاطہ اور تجزیہ سے بھی حیرت و تعجب کے تمام مراحل ہم نے طے نہیں کر لئے، کیونکہ وہ جاندار جسم جس میں یہ معجزات ہر لحظہ مکرّر ہوتے ہیں۔ اسی جسم میں اس کے علاوہ اور بہت سی حیرت انگیزیاں موجود ہیں جو شاید ہماری اس دریافت شدہ حیرت و استعجاب سے کہیں زیادہ ہوں۔ غور کیجئے کہ یہ ننھے ذرّات جمع بھی ہوتے ہیں اور منتشر بھی یہ ترکیب و انتشار ایسے طریقہ پر ہوتا ہے کہ جو تجدّد اور دوامِ حیات کا بھی ضامن ہے ہر جاندار دو جنسوں سے مرکّب ہوتا ہے۔ ہر ایک میں سے خلیہ نکلتا ہے اور وہ باہم مل کر ایک نیا جاندار بن جاتا ہے۔ یہ دونوں خلیئے کبھی جوڑوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور کبھی انفرادی طور پر —— الغرض جس مرحلہ میں جیسا مقام مناسب ہوتا ہے منقسم ہو جاتے ہیں۔ جانداروں کی ہر نوع میں بغیر زیادتی و نقصان کے ان خلیوں کی تعداد یکساں ہوتی ہے۔ ہر جاندار اپنی مخصوص عادتیں لے کر پیدا ہوتا ہے جو ایک مقررہ وقت پر اس کو تناسل کی طرف لاتی ہیں۔ پرندوں میں وقت سے بہت پہلے ہی گھونسلہ تیار کیا جاتا ہے سمندری مچھلیاں اپنی نسل ولادت سے پہلے شور پانی سے نکل کر نہروں اور خلیجوں میں پہنچ جاتی ہیں اور ولادت سے پیشتر ہر جوڑا ایک دوسرے سے ملنے کے لئے بیقرار نظر آتا ہے —— ہم پھر یہی کہیں گے کہ اگر یہ تمام ناگہانی اتّفاقات پر مبنی ہے اور اگر خلق و تدبیر کے مقابلہ میں یہی رائے زیادہ صحیح ہے تو انسانی عقل میں قصد کے معنی بالکل غلط ہیں ——

قرآن کریم نے جہاں کہیں بھی خالق و کریم کے وجود کے اثبات میں برہانِ حیات اور برہانِ نسل پیش کی ہے۔ زندگی رکھنے والوں کو زندگی کی لغت سے خطاب کیا ہے اور عقلمندوں کو عقل کی لغت سے خطاب کیا ہے جس برہان کے ذریعہ قرآن اس کی وحدت ثابت کرتا ہے اس کے مدبّر و حکیم ہونے کے اثبات پر بھی اسی برہانِ حیات یا برہانِ نسل کے ذریعہ استدلال کرتا ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے :۔

" اگر آسمان و زمین خدا کے علاوہ اور بھی کچھ معبود ہوتے تو یہ زمین و آسمان تباہ ہو جاتے۔ وحدانیت کے اثبات میں اس سے مضبوط دلیل پیش نہیں کی جا سکتی، متکلمین اسلام اور توحید پر بحث کرنے والے اس کو برہانِ تمانع کہتے ہیں۔

امام رازی نے لکھا ہے کہ تعددِ آلہہ کی صورت میں فساد ممکن ہے۔ لہذا اللہ نے اس ممکن کو ظاہری بناء پر واقعہ کی صورت میں بیان کر دیا ہے —

امام نور الدّین صابونی سے صاحبِ سفینۃ الراغب نقل کرتے ہیں، تعددِ آلہہ کی مثال میں اگر ان دو معبودوں میں موافقت و مصالحت ہو گی تو اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو ضروری اور جبری ہو گی، اس صورت میں وہ دونوں عاجز و مضطر ٹھہرے۔ یا اختیاری ہو گی مگر دونوں میں اختلاف ہو جانا بھی ممکن ہو گا تو اس صورت میں دلیل کا مدعیٰ حاصل یعنی ایک غالب اور دوسرا مغلوب ہو گا —"

شرح مُلّا جلال دوانی نے خوب لکھا ہے کہ "اس صورت میں نظامِ عالم کے لئے یا تو اُن متعدّد خداؤں کی قدرت اور ارادہ کافی ہو گا یا کافی نہ ہو گا۔ یا اس کیلئے صرف ایک ہی کافی ہو گا۔ پہلی صورت میں دو مکمّل مؤثروں کا ایک معلول پر اجتماع لازم آتا ہے جو محال ہے۔ دوسری صورت میں دونوں خدا عاجز ہوئے کیونکہ ان کی قدرت اسی وقت نافذ ہو سکتی ہے جب کہ دونوں شریک ہوں۔ تیسری صورت میں جب کہ ایک کافی ہے تو دوسرا خالق نہ ہوا، لہذا وہ معبود بھی نہیں ہو سکتا " (اللہ ۔ از عباس محمود) —

معرفتِ الٰہیہ کے

قرآنی دلائل!

امام رازیؒ فرماتے ہیں:۔

خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے وجود کے دلائل قائم کئے ہیں ان میں چند باتوں کا لحاظ رکھا ہے ——

ا — ایک تو یہ کہ قرآن مجید چونکہ خاص و عام دونوں کیلئے نازل کیا گیا ہے، اس لئے خداوند تعالیٰ نے اپنے وجود پر جو دلائل قائم کئے ہیں وہ بہت زیادہ پیچیدہ نہیں ہیں بلکہ قریب الفہم اور دلنشین ہیں ——

۲ — دوسرے یہ کہ قرآنی دلائل کا مقصود بحث و مناظرہ نہیں بلکہ عقائد حقّہ کا اثبات ہے۔ اس لئے قرآن مجید میں خداوند تعالیٰ نے اپنے ثبوت کے دلائل کو دلائل نفس اور دلائل آفاق میں محدود کردیا ہے۔ کیونکہ اس قسم کے دلائل سے بندوں پر خدا کے احسانات کا اظہار ہوتا ہے جس سے بندے کے دل میں خداوند تعالیٰ کی محبّت پیدا ہوتی ہے، اور وہ بحث و نزاع کو چھوڑ کر خدا کی اطاعت و انقیاد پر آمادہ ہوجاتا ہے ——

انہی دونوں اصول کے مطابق خداوند تعالیٰ نے سورہ بقرہ میں اپنے وجود پر یہ دلیل قائم کی ہے ——

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَاءَ بِنَاءً وَّأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَّأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ — (بقرہ - ۳)	لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور ان لوگوں کو جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں پیدا کیا، عجب نہیں تم (آخر کار) عذاب سے بچ جاؤ۔ جس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بنایا اور آسمان کی چھت اور آسمان سے پانی برسا کر اس سے تمہارے کھانے کے پھل پیدا کئے پس کسی کو اللہ کا ہم پلہ نہ بناؤ حالانکہ تم تو جانتے اور بوجھتے ہو —

اور اس دلیل کے متعلق امام رازیؒ لکھتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کے ثبوت کے متعدد طریقے ہیں لیکن حدوثِ اعراض سے استدلال کرنے کا طریقہ سب سے زیادہ قریب الفہم ہے اور یہ طریقہ دلائلِ انفس اور دلائلِ آفاق میں محدود ہے ——

خداوند تعالیٰ نے اس آیت میں ان دونوں دلیلوں کو جمع کر دیا ہے۔ دلیلِ انفس یہ ہے کہ ہر شخص بداہۃً جانتا ہے کہ وہ اس سے پہلے موجود نہ تھا اور اب موجود ہوا ہے لیکن جو چیز عدم کے بعد موجود ہوتی ہے اس کا کوئی موجد ہوتا ہے۔ لیکن اپنا موجد نہ وہ خود شخص ہے نہ اس کے باپ ماں ہیں نہ اور لوگ ہیں۔ کیونکہ اس قسم کی ترکیب سے اور لوگوں کا عجز بداہۃً معلوم ہے، اس لئے ایک ایسے موجد کی ضرورت ہے جو ان موجودات سے مختلف ہوتا ہے کہ وہ ان اشخاص کی ایجاد کر سکے، البتہ اس موقع پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ فصول کی طبیعتیں، آسمان اور ستارے اس قسم کا اثر کیوں نہیں پیدا کر سکتے؟ چونکہ یہ

یہ اعتراض ہو سکتا تھا اس لئے خداوند تعالیٰ نے اس کے بعد یہ بیان کیا کہ یہ چیزیں بھی خود ایک موجد کی محتاج ہیں۔ یعنی یہ کہ اس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بنایا، اور آسمان کی چھت بنائی اور اسی کا نام دلائل آفاق ہے۔ اور اس میں دُنیا کے تمام تغیرات مثلاً رعد، بجلی، ہوا بادل، فصلوں کا اختلاف سب شامل ہے ——

اِس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اجسامِ فلکیہ اور عنصریہ سب کے سب جسمانیت میں مشترک ہیں، اس لئے ان کے مخصوص اوصاف مثلاً ان کی مقدار اور شکل جسمانیت یا جسمانیت کے لوازم کے نتیجہ نہیں ہو سکتے، ورنہ سب میں یہ اوصاف مشترک طور پر پائے جائیں گے، اس لئے ان کا مخصص ان سب سے الگ ہونا چاہیئے لیکن اگر وہ بھی جسم نہ ہو تو یا موجب بالذّات ہوگا یا مختار، پہلی صورت اس لئے باطل ہے کہ اس صورت میں بعض اجسام کا بعض اوصاف کے ساتھ کے متصف ہونا، دوسرے اجسام سے اولیٰ نہ ہوگا، اس لئے اس کو قادر مختار ہونا چاہیئے، اس سے ثابت ہُوا کہ تمام اجسام ایک ایسے مؤثر قادر کے محتاج ہیں جو نہ جسم ہے نہ جسمانی ہے[۱] ——

ان سب کے بعد امام رازی نے زمین اور آسمان وغیرہ کے فوائد بتائے ہیں تاکہ ان سے خداوند تعالیٰ کے احسانات کا ظہور ہو اور بندے کا دِل اس کی محبّت سے معمور ہو جائے خدا کے وجود اور قدرت و حکمت کے متعلّق قرآن مجید کی ایک آیت یہ ہے :——

هو الذی یریکم البرق خوفاً وطمعاً وینشئ السحاب الثقال۔ (القرآن) (رعد-۳)	وہی (قادر مطلق) جو ڈرانے اور (تیز بارش کی) امید دلانے کے لئے (بجلی کی چمک) تم لوگوں کو دکھاتا اور (پانی سے بھرے ہوئے) بوجھل بادلوں کو اُبھارتا ہے ——

---

[۱] (تفسیر کبیر جلد اوّل صفحہ ۲۱۷، ۲۱۸)

لیکن یہ دلیل بھی محض خشک فلسفیانہ دلیل نہیں ہے بلکہ رُوحِ قرآنی کے بالکل مُطابق ہے۔ چنانچہ امام رازی اس کے متعلّق لکھتے ہیں: ـــــــ

وانها تشبه النعم والاحسان من بعض الوجوه وتشبه العذاب والقهر ـــ	اور یہ دلیل بعض وجوہ سے نعمت اور احسان سے اور بعض وجوہ سے عذاب قہر سے مشابہت رکھتی ہے ـــ

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ بجلی خدا کی قدرت کی نہایت عجیب دلیل ہے کیونکہ اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ بادل، پانی کے مرطوب اور ہوا اور آگ کے اجزاء سے مرکّب ہے لیکن پانی کے اجزاء اس میں غالب ہیں اور پانی مرطوب اور سرد اور آگ گرم اور خشک ہے اور ضد کا ضد تام سے ظاہر ہونا عقل کے خلاف ہے۔ اس لئے ایک ایسے صانع مختار کا وجود ضروری ہے جو ضد کو ضد سے پیدا کر سکے ـــــ

اس طرح بادلوں کا پیدا کرنا بھی خدا کی قدرت اور حکمت کی دلیل ہے کیونکہ پانی کے اجزاء یا تو فضا میں پیدا ہوئے ہیں یا یہ کہ وہ زمین سے چڑھ کر اوپر گئے ہیں۔ پہلی صورت میں وہ ایک حکیم قادر کے پیدا کرنے سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور یہی مقصود ہے لیکن دوسری صورت میں وہ اجزاء زمین سے چڑھ کر ہوا کے سرد طبقے میں پہنچے ہیں اور سرد ہو کر بوجھل ہو گئے ہیں، پھر زمین کی طرف واپس آئے ہیں

بارش کی صورت مختلف ہوتی ہے، کبھی بوندیں بڑی ہوتی ہیں، کبھی چھوٹی، کبھی قریب قریب گرتی ہیں، کبھی دُور دُور۔ کبھی دیر تک بارش ہوتی ہے کبھی کم، اس لئے باوجودیکہ زمین کی طبیعت ایک اور بخارات پیدا کرنے والے سُورج کی طبیعت ایک ہے۔ بارش کے اوصاف کا یہ اختلاف کسی فاعل مختار کی تخصیص ہی سے ہوگا ـــــ

امام رازیؒ کا علمی مقالہ

توحیدِ باری تعالیٰ

حکماء و متکلّمین دونوں اس پر متّفق ہیں کہ واجب الوجود یعنی خدا صرف ایک ہے۔ لیکن دلائل دونوں کے مختلف ہیں، حکماء فلاسفہ نے اس پر جو دلیلیں قائم کی ہیں ان کو امام رازی نے مباحث مشرقیہ میں بیان کیا ہے۔ ان میں پہلی دلیل یہ ہے کہ اگر دو چیزیں وجوب وجود میں شریک اور ماہیّت و تعین میں مختلف ہوں تو ہر ایک کا وجوب وجود ہر ایک کے تشخص و تعین سے مختلف ہوگا۔ اب صرف دو صورتیں ہوں گی ——

۱ —— ایک تو یہ کہ ان میں ہر ایک کے وجوب، وجود اور تعین میں تلازم ہوگا۔

۲ —— یا یہ کہ دونوں میں تلازم نہ ہوگا ——

اگر دونوں میں تلازم نہیں ہے تو بذاتِ خود وجوب وجود اس تعین کو نہ چاہے گا اسی طرح وہ تعین بھی وجوب وجود کو نہ چاہے گا۔ اس بنا پر اس وجوب وجود کو اس تعین کے ساتھ وجوبِ وجود کے ساتھ متصّف کرنے کے لئے ایک سببِ خارجی کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے جن دو ذاتوں کو واجب الوجود تسلیم کیا گیا ہے۔ وہ ممکن الوجود اور اپنی ایجاد و تعین میں دوسرے کی محتاج ہوجائیں گی، پہلی صورت میں یعنی جب وجوب وجود اور تعین میں تلازم ہو تو یہ تلازم یا تو وجوب وجود اور تعین کی نفسِ حقیقت کا نتیجہ نہ ہوگا یا یہ کہ ان کی

نفسِ حقیقت کا نتیجہ ہوگا اگر ان کی نفسِ حقیقت کا نتیجہ نہ ہو تو اس کا کوئی خارجی سبب ہوگا اور جو چیز خارجی سبب کی محتاج ہوتی ہے وہ ممکن ہوتی ہے۔ اس لئے جن دو ذاتوں کو واجب الوجود قرار دیا گیا ہے وہ ممکن ہوجائیں گی اور اگر یہ تلازم دونوں کی نفسِ حقیقت کا اقتضا ہو تو لازمی طور پر ایک دوسرے کی علّت ہوگا اور دوسرا اس کا معلول ہوگا۔ کیونکہ اگر ہر ایک دوسرے کی علّت ہو تو اس سے دور لازم آئے گا، لیکن تعین وجوب وجود کی علّت نہیں ہوسکتا کیونکہ اس صورت میں اگرچہ وجوب وجود اس ذاتِ خاص میں داخل ہے تاہم وہ اس تعین سے خارج ہے، کیونکہ وجوبِ وجود ان دونوں خدا میں مشترک طور پر پایا جاتا ہے اور وہ دونوں کو ایک دوسرے سے امتیاز صرف تعین سے ہوتی ہے۔ اور ما بہ الاشتراک ما بہ الامتیاز سے الگ ہوتا ہے، اس بناء پر وجوبِ بالذّات دوسری ماہیّت کا تابع ہے ——

اور یہ محال ہے، اب لامحالہ ماننا پڑے گا کہ وجوب بالذّات اس تعین کی علّت ہے، اس لئے جہاں وجوب بالذات پایا جائے گا اس کا معلول یعنی یہ تعین بھی پایا جائے گا، اس لئے ہر واجب الوجود صرف ایک ہی ہوگا —— اس سے ثابت ہوا کہ واجب الوجود صرف ایک ہے ——

متکلمین نے خداوند تعالیٰ نے خداوند تعالیٰ کی وحدانیت پر جو دلیل قائم کی ہے۔ اس کی بنیاد قرآن مجید کی اس آیت پر ہے :—

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا۔ (انبیاء)	اگر زمین و آسمان میں خدا کے سوا اور خدا ہوتے تو لازماً زمین و آسمان برباد ہوجاتے ——

اگر اس دلیل کو خطابی دلیل مان لیا جائے تو اس کے لئے کسی طویل تقریر کی ضرورت نہیں، فارسی کا مشہور مقولہ ہے کہ :—

"دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند"

اس لیے اگر آسمان و زمین میں متعدّد خدا ہوتے تو ان میں جیسا کہ دُنیوی بادشاہوں میں ہوا کرتا ہے باہم اختلاف ہوتا اور اختلاف کے بعد جنگ و جدل کی نوبت پہنچتی اور دُنیا کا یہ نظم و نسق قائم نہ رہتا ـــــ

قرآن مجید کی دوسری آیتوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے :ـــــ

وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلٰهٍ إِذًا لَذَهَبَ كُلُّ إِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ـــــ (مومنون) ـــــ	اور نہ اس کے ساتھ کوئی خدا ہے ورنہ ہر ایک خدا اپنی مخلوقات کو الگ الگ لیے پھرتا اور (آپس میں لڑتے اور آخر کار) ایک دوسرے پر غالب آجاتا ـــــ

قُلْ لَوْ كَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذًا لَابْتَغَوْا إِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا ـــــ (بنی اسرائیل)	(اے پیغمبرؐ ان لوگوں سے کہو) اگر اگر خدا کے ساتھ جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں (اور) معبود (بھی) ہوتے تو اس صورت میں ان معبودوں نے (کبھی کا) مالک عرش (یعنی خدا) تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈھ نکالا ہوتا ـــــ

لیکن امام رازی صاحب نے تفسیر کبیر اور علم کلام کی کتابوں میں اس دلیل کو برہانی قرار دیا ہے اور اس کی جو تقریر کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر دو خدا کا وجود فرض کیا جائے تو ہر ایک تمام مقدورات پر قادر ہوگا۔ اس لیے ہر ایک زید میں حرکت اور سکون پیدا کر سکے گا، اب اگر ایک نے زید میں حرکت اور دوسرے نے سکون پیدا کرنا چاہا اور

دونوں اپنے اپنے ارادہ میں کامیاب ہو گئے تو اس سے ضدین یعنی حرکت وسکون کا اجتماع لازم آئے گا۔ اور یہ محال ہے اور اگر دونوں اپنے اپنے ارادہ میں ناکامیاب رہے تو یہ بھی محال ہے، کیونکہ ہر ایک کی ارادہ کی کامیابی میں دوسرے کا ارادہ باہم متضاد ہونے کی وجہ سے مانع ہے۔ اس لئے ایک اپنے ارادہ میں اس وقت ناکامیاب ہو گا جب دوسرا اپنے ارادہ میں کامیاب ہو۔ اسی طرح جب دوسرا اپنے ارادہ میں ناکامیاب ہو گا تو پہلا کامیاب ہو گا اس لئے اگر دونوں اپنے اپنے ارادہ میں ناکامیاب رہیں تو دونوں اپنے اپنے ارادہ میں کامیاب بھی ہوں گے اور یہ محال ہے ——

اور اگر صرف ایک کا مقصد حاصل ہو اور دوسرا اپنے ارادہ میں ناکامیاب رہے تو یہ صورت بھی محال ہے۔ کیونکہ اوّلاً تو دونوں خدا یکساں طور پر قدرت رکھتے ہیں۔ اس لئے ایک کی قدرت کو دوسرے کی قدرت پر ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ جو خدا اپنے ارادہ میں ناکامیاب رہا وہ عاجز ہو گا اور خدا کی ذات میں عجز ایک عیب ہے۔
لیکن اس دلیل کی صحت اس پر موقوف ہے کہ ان دونوں معبودوں میں اختلاف کا ہونا لازمی اور قطعی ہو۔ حالانکہ وہ قطعی ولازمی نہیں بلکہ ممکن ہے، اس لئے دو معبودوں کی موجودگی میں نظامِ عالم کی ابتری ممکن ہو گی لازمی نہ ہو گی، حالانکہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لازمی اور قطعی ہے ——

امام رازیؒ نے اس اعتراض سے بچنے کے لئے اس دلیل کی ایک دوسری تقریر کی ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک چیز کی دو علّت تامہ نہیں ہو سکتی، کیونکہ علّت کی موجودگی میں معلول کا وجود ضروری ہو جاتا ہے، اس لئے اگر زید کا خالق ایک خدا ہے تو اس کے وجود کے ساتھ زید کا وجود ضروری ہو جائے اور اس کو دوسرے خدا کی ضرورت نہ ہو گی لیکن چونکہ یہ فرض کیا گیا ہے کہ زید کو دونوں خدا نے مل کر پیدا کیا ہے۔ اس لئے وہ دوسرے خدا کا بھی محتاج ہو گا۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ ہر ایک خدا سے بے نیاز

بھی ہو گا اور ہر ایک خدا کا محتاج بھی ہو گا۔ اور یہ محال ہے لیکن اس دلیل پر یہ بھی اعتراض ہوتا ہے کہ یہ صرف اُس صورت میں کارآمد ہو سکتی ہے جب ان میں ہر ایک خدا چاہے کہ ایک چیز مثلاً زید کو صرف وہی پیدا کرے اور یہ استبداد و اختلاف کی صورت ہے لیکن یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ ہر ایک دوسرے خدا کی مخلوقات میں کسی قسم کی مداخلت کرنے کا ارادہ نہ کرے، مثلاً ایک زمین کو پیدا کرے، ایک آسمان کو، ایک حیوانات کو پیدا کرے، ایک نباتات کو ـــــ اسی طرح تقسیمِ عمل کے اصول پر دونوں دُنیا کے کاروبار کو چلائیں اور نظامِ عالم میں نہ کوئی خلل ہو اور نہ ایک معلول کے لیے دو علتوں کی ضرورت ہو۔

امام رازی صاحب نے اس کا جواب دیا ہے کہ ایجاد کے معنی اگر نفسِ قدرت و ارادہ کے ہیں تو اس سے موجد میں اشتراک پیدا ہو جائے گا کیونکہ دونوں یکساں طور پر قدرت و ارادہ رکھتے ہیں ـــــ اور اگر ایجاد کے معنی خود مخلوق مثلاً زید کے ہیں تو جبکہ دونوں معبودوں کو یکساں طور پر قدرت و ارادہ حاصل ہے تو اس ترجیح کی کیا وجہ ہے کہ وہ مخلوق صرف ایک کی قدرت و ارادہ سے پیدا ہو اور دوسرے کی قدرت و ارادہ سے پیدا نہ ہو، اور اگر ایجاد کے معنی کسی اور چیز کے ہیں تو وہ چیز یا قدیم ہو گی یا حادث، اگر قدیم ہے تو اس کے ساتھ ارادہ کا تعلق ہی نہیں ہو سکتا، اور اگر حادث ہے تو یہ وہی دوسری صورت ہے ـــــ

امام غزالیؒ نے اس مسئلہ کو امام صاحب سے زیادہ صاف اور واضح پیرائے میں لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "دو خالق کے درمیان مخلوقات کی تقسیم کی صرف دو صورتیں ہیں۔

(۱) ایک تو یہ ہے کہ بعض جواہر و اعراض کو ایک خدا پیدا کرے اور بعض کو دُوسرا، مثلاً ایک زمین کو پیدا کرے اور دُوسرا آسمان کو ـــــ

(۲) تمام جواہر کو ایک خدا پیدا کرے اور تمام اعراض کو دُوسرا ـــــ

پہلی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس خدا نے آسمان کو پیدا کیا ہے وہ زمین

کے پیدا کرنے پر قادر ہے یا نہیں ؟ اگر وہ قادر ہے تو دونوں کی قدرت میں کوئی امتیاز نہیں، اس لئے ان کے مقدور میں بھی کوئی امتیاز نہ ہوگا، اسی لئے جس خدا نے آسمان کو پیدا کیا ہے، وہ زمین کو بھی پیدا کر سکے گا اور ایک کی ایجاد کو دوسرے کی ایجاد پر کوئی ترجیح حاصل نہ ہو لیکن اگر وہ زمین کے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے تو یہ محال ہے کیونکہ تمام جواہر متماثل ہیں یعنی ان کی حقیقت ایک ہے اور ایک خاص چیز میں ان کا واقع ہونا بھی متماثل ہے اور جو خدا ایک چیز پر قادر ہے وہ اس کے مثل پر بھی قادر ہو سکتا ہے کیونکہ اس کی قدرت قدیم ہے اور اس کا تعلق متعدد اجسام و جواہر سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہ صرف ایک ہی جسم اور جوہر تک محدود نہیں ہے اور جب قدرت حادثہ کے برخلاف اس کا تعلق متعدد مقدور سے ہو سکتا ہے تو بعض مقدور کو دوسرے مقدور پر ترجیح کی کیا وجہ ہے بلکہ جب کہ اس کے مقدورات غیر متناہی ہیں تو ہر ممکن الوجود جوہر اس کی قدرت کے تحت میں داخل ہو سکتا ہے ——

دوسری صورت میں جبکہ ایک جوہر اور دوسرا عرض کے پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے تو چونکہ یہ دونوں چیزیں مختلف الماہیتہ ہیں اس لئے یہ ضروری نہیں کہ جس خدا کو جوہر کے پیدا کرنے کی قدرت حاصل ہو وہ عرض کے پیدا کرنے پر بھی قادر ہو لیکن عرض جوہر کا اور جوہر عرض کا محتاج ہے، اس لئے ہر خدا کا فعل دوسرے کے فعل پر موقوف ہوگا اس صورت میں وہ اس کو پیدا نہ کر سکے گا، مثلاً ایک خدا عرض کو پیدا کرنا چاہتا ہے لیکن جو خدا جوہر کے پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہ جوہر کے پیدا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا، اس صورت میں جو خدا عرض کو پیدا کر سکتا ہے، وہ عاجز ہو جائیگا، اور عجز قدرت کے منافی ہے۔ یہی حالت جوہر کی بھی ہے کہ جو خدا جوہر کے پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہ جوہر کو پیدا کرنا چاہتا ہے، لیکن عرض کا پیدا کرنے والا اس کی مخالفت کرتا ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ دونوں میں باہم اتفاق ہو یعنی جب ایک خدا جوہر کو پیدا کرے

تو دوسرا عرض کے پیدا کرنے پر آمادہ ہو جائے، یا دُوسرا خدا جب عرض کو پیدا کرنا چاہے تو دوسرا جوہر کو پیدا کر دے، لیکن اگر یہ اتفاق واجب یعنی لازمی اور ضروری ہے تو یہ قدرت کے منافی ہے کیونکہ اس صورت میں جب ایک خُدا جوہر اور دوسرا عرض کو پیدا کرے گا تو ہر ایک عرض اور جوہر کے پیدا کرنے پر مجبور ہو جائے گا اور مجبوری قدرت کے منافی ہے۔

اور اگر ممکن ہے یعنی اس قسم کا اتّفاق ضروری اور لازمی نہیں ہے تو کوئی جوہر یا عرض پیدا ہی نہیں ہو سکتا، کیونکہ ایک خدا جب جوہر یا عرض کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو دُوسرا عرض یا جوہر کے پیدا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا، اور کوئی جوہر یا عرض بغیر عرض اور جوہر کے پیدا نہیں ہو سکتا۔

البتہ انہوں نے اس دلیل کی جو دوسری تقریر کی ہے اس پر ان کو کامل اعتماد ہے، اور اس کی نسبت لکھتے ہیں:۔

واعلموا انك لما وقفت على حقيقة هذه الدلالة عرفت ان جميع ما في هذا العالم العلوي والسفلي من المحدثات والمخلوقات فهو دليل على وحدانية الله تعالى بل وجود كل واحد من الجواهر والاعراض دليل تام	تم کو جاننا چاہیئے کہ جب تم اس دلالت کی حقیقت سے واقف ہو گئے تو تم کو معلوم ہو گیا کہ اس عالم علوی و سفلی میں جس قدر مخلوقات اور محدثات ہیں وہ خدا کی واحدانیت کی دلیل ہیں بلکہ ہر ایک جوہر اور عرض کا وجود اس طریقہ کے مطابق جس کو ہم نے بیان کیا، توحید کی دلیل تام ہے، اور اس دلیل کو خداوند تعالیٰ نے اپنی کتاب کے

علی التوحید من الوجہ الذی بیناہ وھذہ الدلالۃ قد ذکرھا اللہ تعالیٰ فی مواضع من کتابہ[1]	متعدد مواقع میں بیان کیا ہے۔ (امام رازیؒ از عبدالسلام ندوی)

اس عاجز ابوالخیر کے نزدیک اس کا جواب یہ ہے۔ اگر کائنات میں ۲ دو خدا ہوں تو دونوں میں الوہیت ما بہ الاشتراک پائی جائے گی، یعنی دونوں الوہیّت کی وصف میں برابر کے شریک ہوں گے۔ اب دونوں میں وہ کونسا ما بہ الامتیاز و صف ہے۔ جو ایک خدا اس دوسرے خُدا سے ممتاز ہو سکے، جب تک ان میں کوئی امتیازی صفت نہ پائی جائے، ان دونوں کا ۲ دو خُدا ہونا ثابت نہیں ہوتا جب ان میں کوئی امتیازی صفت پائی جائے گی جب تفاوت کی وجہ سے ایک خُدا ناقص ثابت ہو جائے گا۔ مثلاً ایک خدا دوسرے خُدا سے اس لئے ممتاز ہے۔ ایک جوہر پیدا کر سکتا ہے اور دُوسرا عرض۔ اب ظاہر ہے جو خُدا جوہر پیدا کرنے میں دوسرے خُدا سے ممتاز نظر آتا ہے۔ وہ جب عرض پیدا نہیں کر سکتا۔ تو یہ خدا لازماً اس دوسرے خُدا سے ناقص ہو گا۔ اس سے ثابت ہُوا کہ کائنات میں صرف ایک خُدا ہی ہو سکتا ہے ——

---

[1] —— (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۱۳۴)

قوانینِ فطرت میں

تغیّر کا امکان

اس میں شک نہیں پہلے بعض گوشوں سے اس قسم کی آوازیں سنائی دیتی تھیں کہ کائنات کا ہر ذرّہ قانونِ قدرت کا پابند ہے اور وہم و بے عقلی انسان کی بدترین دشمن ہے اور عقل و ہمّت بہترین دوست " ۔۔۔ (عجائباتِ حیات، از ہیگل)

لیکن ۱۹۲۰ء کے بعد کوانٹم نظریہ کی بدولت سائنس میں جو بھونچال آیا ہے اس نے سائنس کی دنیا میں بھی اب ایسے بے باکانہ و مدعیانہ نعروں کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ فلسفہ میں تو علّت و معلول کے لزوم و وجوب کی بنیادوں کو ہیوم نے کھوکھلا کر دیا تھا، البتہ سائنس کی بنیاد ہی فطرت کی یکسانی یا علیت کے اٹل قانون پر رکھی جاتی تھی۔

اس ستم ظریفی کو کیا کہیئے کہ خود سائنسی تجربات و اختبارات ہی کی راہ سے یہ اٹل قانون نہ صرف مجروح اور متزلزل ہو گیا ہے بلکہ سر آرتھر ایڈنگٹن جیسے اکابرِ سائنس کے نزدیک اس کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دینا پڑا ہے۔ چند سال قبل دنیائے سائنس کے تازہ ترین معلومات و خیالات پر "ماڈرن بلیف" کے نام سے مقالوں کا ایک سلسلہ شائع ہوا تھا۔ اس کے جستہ جستہ اقتباسات یہ ہیں:-

"کوانٹم نظریہ نے بڑا زبردست انقلاب برپا کر دیا ہے کہ مادی

دُنیا میں اب تک علل ومعلول کے قانون کی فرمانروائی کو اٹل تصوّر کیا جاتا تھا، سارے طبعی واقعات وحوادث بالکلیہ جبری یا وجوبی قوانین کے تابع یقین کئے جاتے تھے، سلسلۂ علل ومعلولات میں کہیں کوئی خلل ورخنہ نہ تھا مگر ۱۹۲۷ء میں اس خیال ویقین کو سخت دھکا لگا اور ماہرینِ طبیعات نے دیکھا کہ علیت کے وُجوب وکلیت کو مادّی دُنیا سے رخصت کرنا پڑا اور سارے قرائن اسی کے نظر آتے ہیں کہ وجوبی وقطعی علیت کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہو گیا ———

ابھی بالکل حال تک قانونِ علیت کو سائنسی تحقیقات کا بالاتفاق بُنیادی اصول قرار دیا جاتا تھا لیکن اب اسی اصول کو ترک کر دینے کا سوال پیدا ہو گیا ہے کہ آیا کارخانۂ فطرت میں ہر واقعہ لزوماً کسی ایسے دوسرے واقعہ ہی سے پیدا ہوتا ہے جس کو علّت کہا جاتا ہے؟ یا اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حوادثِ فطرت کی تہہ میں کوئی ایسی شے کارفرما ہے جس کو اختیاری یا آزادی ارادہ کہا جاتا ہے۔ ماحصل یہ کہ اس وقت تک طبعی مظاہر کی تحلیل کا یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ ہم کو کہیں بھی وجوبی یا جبری قانون کی موجودگی شہادت نہیں ملتی ——" (بحوالہ جرنل آف فلاسفی ۱۹۳۳ء)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ قوانینِ فطرت کا سرے سے کوئی وجود نہیں بلکہ "ان" کی حیثیت اعداد وشمار کے لئے قوانین کی رہ جاتی ہے۔ زندگی کا بیمہ کرنے والی کمپنیاں کوئی ایسا قانون نہیں جانتیں ہیں کہ فلاں شخص چالیس سال کی عمر میں مرجائے گا لیکن اتنا جانتی ہیں کہ کسی بڑی جماعت میں اتنے فی صد آدمی چالیس کے سن میں مرجائیں گے یعنی افراد کامل ناقابل پیش بینی ہونے کے باوجود جماعت کی نسبت پیش بینی ممکن ہے پس قوانینِ فطرت صرف اسی معنی میں موجود ہیں۔ (ماڈرن بیلیف) ———

بالفاظِ دیگر قانونِ فطرت کی نوعیت دراصل قانونِ عادت کی ہے یعنی کسی خاص فرد کے بارے میں وجوباً پیش گوئی نہیں کی جا سکتی کہ فلاں عمر میں مر جائے گا، البتہ عادتاً یہ معلوم ہے کہ کسی بڑی جماعت میں اتنے فی صد چالیس سال کی عمر میں مر جائیں گے۔ مذہب کی زبان میں اسی قانونِ عادت کو عادۃ اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کی بنا پر بھی عملِ فطرت کی یکسانی یا قوانینِ فطرت کے نفس وجود کا انکار نہیں لازم آتا۔ البتہ ان قوانین کا منشاء یہ ہے بہرے بے علم و اختیار مادہ کا اٹل وجوب ولزوم سے نہیں، بلکہ ایک علم اختیار والی ذات (اللہ تعالیٰ) کی عادتِ جاریہ ہے جو کسی حکمت ومشیت کے تحت کبھی کبھی اس عادت جاریہ کے خلاف بھی کر سکتی اور کرتی ہے —— یہی معجزہ ہے اور بقول مشہور سائنسدان ڈاکٹر کارپنٹر کے کہ قائل مذہب سائنسدان کو اس کے ماننے میں کوئی عقلی دشواری نہیں پیش آسکتی۔ کہ خالقِ فطرت اگر چاہے تو کبھی کبھی قوانین فطرت کے خلاف بھی کر سکتا ہے۔ ہم کو معجزات کے خلاف اگر سائنس کے کسی ایسے فتویٰ کا علم نہیں جو معتبر شہادت کی موجودگی میں ان کے قبول سے مانع ہو۔ (ماڈرن بیلف)

جب کارپنٹر کے زمانہ ہی میں سائنس کا کوئی ایسا فتویٰ معلوم نہ تھا تو اب کوانٹم نظریہ کے بعد جب کہ کلام وفلسفہ کے نرے قیاسات سے گزر کر خود سائنس کی دنیا میں اور سائنس ہی کی راہ سے فطرت یا علیت کے نام نہاد اٹل قوانین کا وجود اتنا مشتبہ ہو گیا ہے کہ مادی دنیا سے بظاہر ان کو ہمیشہ کے لئے رخصت کرنا پڑ رہا ہے ——

کیا خالق فطرت کبھی کبھی قوانینِ فطرت کے خلاف کرسکتا ہے

بلکہ ایک نامور عالم طبیعات پروفیسر ڈآبیر کا اعتراف یہ ہے کہ اس امر کی ہمارے پاس خاصی شہادت موجود ہے جس کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بعض طبعی حوادث

اس طرح وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ ان کے تمام معمولی علل واسباب غائب ہوتے ہیں، اجسام حرکت کرتے ہیں۔ دراں حالیکہ نہ کوئی شخص ان کو چھو رہا ہے اور نہ برقی یا مقناطیسی عوامل کا پتہ ہے۔ اس کی بھی شہادت موجود ہے کہ ایک نفس کا خیال دوسرے نفس میں (بلا کسی وساطت کے) پہنچ جاسکتا ہے اور جس قسم کے واقعات کو معجزہ سمجھا جاتا تھا ان کا وقوع اب غیر اغلب نہیں رہا ہے ——— (کتاب مادّہ و حرکت از ڈالبیر)

نفس خارق فطرت واقعات کے لئے ہیوم کے نزدیک انسانی شہادت کا ایک درجہ ایسا موجود ہے کہ جس کی بناء پر ان کو قبول کیا جاسکتا ہے ———

"فرض کرو کہ تمام زبانوں کے تمام مصنّفین اس پر متفق ہوں کہ یکم جنوری ۱۶۰۰ء سے لے کر آٹھ دن تک برابر تمام روئے زمین پر تاریکی چھائی رہی۔ یہ بھی فرض کرو کہ اس خارق عادت واقعہ کی روایت آج تک لوگوں کی زبان پر ہے اور دوسرے ممالک سے جو سیاح آتے ہیں وہ بے کم و کاست بلاشبہ تناقص وہاں کے لوگوں کی یہی روایت بیان کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہمارے زمانے کے حکماء کا کام شک کے بجائے اس واقعہ کا یقین کرکے اس کی توجیہ اور اس کے علل واسباب کی جستجو ہوگی۔

کائنات فطرت میں انحطاط، فنا و فساد کی مثالیں اس کثرت سے ملتی ہیں کہ اگر کسی حادثہ سے اس کی تباہی کے آثار پائے جائیں تو اس کے بارے میں انسانی شہادت قابل قبول ہوگی، بشرطیکہ یہ نہایت وسیع، متواتر اور متفق علیہ ہو ——— (فہم انسانی۔ از ہیوم) ———

خالق فطرت، فوق الفطرت امور میں دخل دے سکتا ہے۔

کوئی شخص سرے سے ایمان نہیں رکھتا یعنی سرے سے خدا اور مذہب ہی کا منکر ہے تو

ظاہر ہے کہ اس کے لئے معجزہ تصدیقِ نبوّت کی نہ کوئی دلیل بن سکتا ہے اور نہ آیت۔ کسی نبی کے صادق یا کاذب ہونے کا تصفیہ تو اس کے بعد کی شے ہے کہ پہلے آدمی کا نفس اس اَمر کا قائل ہو کہ خدا کا کوئی وجود ہے اور وہ ہدایت خلق کے لئے انبیاء کو بھیجتا یا بھیج سکتا ہے۔ جو آدمی نقطہ، خط، یا سطح وغیرہ مبادی اقلیدس کا ہی قائل نہیں اس کو تم اقلیدس کی کوئی شکل کیسے سمجھا سکتے ہو۔ جس طرح علوم کی فرعی تفصیلات کے ماننے کے لئے پہلے ان کے مبادی کا ماننا لازمی ہے۔ اسی طرح تفصیلات مذہب پر یقین کرنے کے لئے پہلے نفس مذہب کا یقین ضروری ہے۔ اسٹورٹ مِل نے ہیوم کے انکارِ معجزات کی تنقیح کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"جو شخص کسی فوق الفطرت ہستی اور انسانی معاملات میں اس کی مداخلت کا پہلے ہی سے قائل نہیں ہے اس کے سامنے اگر انسان کی نسبت فوق الفطرت یا خارقِ عادت باتوں کی روایت کی جائے تو وہ ان کو معجزہ نہ مانے گا، معجزات سے خود خدا کا وجود نہیں ثابت کیا جا سکتا۔ اس لئے اگر خدا کا اعتقاد پہلے ہی سے موجود نہ ہو تو کسی فوق الفطرت ہستی کی مداخلت کے علاوہ معجزہ نما واقعات کی اور بھی توجیہات ممکن ہیں، یہاں تک تو ہیوم کی دلیل بامعنی کہی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر ایک ایسی ذات کا وجود قطعی یا غالب طور پر بھی مان لیا جائے تو جو موجودہ نظامِ فطرت کی خالق ہے اور اس لئے اس میں تغیّر و ترمیم بھی کر سکتی ہے تو ہیوم کی دلیل بے معنی ہو جاتی ہے جب تم نے خدا کو مان لیا تو پھر جس شے کو اس کے ارادہ نے پیدا کیا تھا اس پر اس ارادہ کا براہِ راست عمل و اثر خواہ مخواہ کا فرض نہیں رہتا بلکہ ایک سنجیدہ "امکان" بن جاتا ہے، کیونکہ اس صورت میں سوال کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے اور خدا کی مداخلت یا عدمِ مداخلت کا فیصلہ اس بحث پر ٹھہرتا ہے کہ کائنات

فطرت میں اس کا طریقِ عمل کیا رہا ہے یا عقلاً کیا رہنا چاہیئے۔"
(مذہب پر تین مضامین از مل)

معجزہ خلافِ فطرت نہیں

اسٹورٹ مل نے ایک اور غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے وہ یہ کہ خدا کو مان لینے کے بعد معجزہ کو قانونِ فطرت کا سرے سے خارق ہی نہیں کہا جا سکتا۔ پتھر کو اُوپر پھینکو اور کوئی شے بیچ میں مانع اور عائق نہ ہو تو اس صورت میں اس کا زمین پر لوٹ کر نہ گرنا یا ہوا میں معلق رہنا بے شک خلافِ فطرت ہو گا۔ لیکن اگر اس کو بیچ میں کوئی روک لے تو زمین پر نہ گرنا بالکل خارقِ عادت نہ ہو گا کیونکہ مانع موجود ہے۔ معجزہ کی صورت میں جو ارادۂ خداوندی معمولی سلسلہ علل و اسباب کا خالق ہے وہی اس کے عمل سے مانع ہو جاتا ہے۔ لہذا معجزہ نہ خلافِ فطرت ہے اور نہ بلا علت کیونکہ عمل علت کی شرط تو یہ ہے کہ مانع نہ موجود ہو اور یہاں موجود ہے ——— (مذہب پر تین مضامین۔ از مل)

مادّہ کی ازلیت اور آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت

نئی بات جو سائنس اور سائنس دانوں کے نام سے مرعوب ذہنوں اور عقلوں کے لئے خصوصاً لائقِ توجہ ہے یہ ہے کہ مادہ کی بظاہر جس ٹھوس چٹان پر مادیت یا طبعی عوامل و قوانین کی پوری عمارت کھڑی تھی وہ خود نئی طبیعات ہی میں برف کی طرح پگھل رہی ہے اب ازلی و غیر فانی مادہ اور ٹھوس سالمات پرانا افسانہ ہو چکے ہیں۔ قائم بالذات جوہر کی حیثیت سے مادّہ کو اب کوئی اساسی حقیقت نہیں تسلیم کیا جاتا۔ وہ اب عملاً برقی توانائی یا برقیات میں گم ہو کر رہ گیا ہے۔ لیکن خود برق یا برقیات کی انتہائی حقیقت کیا ہے، کوئی نہیں جانتا، یہی نہیں بلکہ مادّہ کو کسی معنی میں بھی موجود جاننے کے لئے عام انسانی ذہن و دماغ کیلئے

کم از کم اتنا سہارا نا گزیر تھا کہ وہ کسی جگہ (یا مکان میں) موجود ہے لیکن نظریہ اضافیت نے اس آخری سہارے کو بھی چھین لیا ——

"مادہ جو ہماری عام فہم و عقل کے لئے ایک موجود فی المکان اور قائم فی الزمان جوہر تھا اور کائنات نام تھا مادہ کے ڈھیروں ڈلوں یا ایسے مادی جوہروں کا جو خاص خاص قوانین کے مطابق زمان و مکان میں اِدھر سے اُدھر مارے مارے پھرتے تھے اب جو بڑا انقلاب سائنس کے نقطۂ نظر سے برپا ہوا ہے وہ صحیح معنی میں اسی واقعہ کا نتیجہ ہے کہ مادہ اور زمان و مکان سرے سے تین جُداگانہ حقائق ہی نہیں قرار دیئے جاتے"۔

—— (ماڈرن بلیف ص۱۵۱) ——

ایک عام آدمی عُریاں الفاظ میں اس کے سوا کیا سمجھ سکتا ہے کہ مادہ نہ کسی جگہ ہے نہ کسی وقت میں یعنی نہ کسی زبان میں تو پھر "ہے" کے کیا معنی؟ اضافیت کے اس شاہکار کو پُوری طرح سمجھنا یا سمجھانا تو اعلیٰ ریاضیات کے ماہرین ہی کا کام ہے۔ عام عامیوں کو سچ پوچھیئے تو ایسے مادّہ کی نسبت جو زمان و مکان سے اگر یا مستقل بالذات ہو کر کسی جگہ اور وقت میں یا زمان و مکان کے مظروف کی حیثیت سے نہ پایا جاتا ہو بے ساختہ یہی کہنا پڑتا ہے کہ "ریاضیات نے تحلیل کرتے کرتے ہماری خارجی (یا مادی) دُنیا کو قریباً عدم تک پہنچا دیا ہے۔ اور یہ تو بہرحال واضح ہو گیا ہے کہ کائنات کو کوئی مشین نہیں قرار دیا جا سکتا پُرانی مادیّت دیوالیہ ہو چکی ہے۔ یعنی وہ مادیّت جو کائنات، زندگی اور ذہن سب کا محض ایک مادّی تصوّر رکھتی تھی۔ اسی طرح سائنس و ریاضی کے جھروکوں سے بھی فلسفیانہ تصوّرت ہی جھانکنے لگی ہے۔ حتیٰ کہ: ——

" سائنس دانوں کو طبعی کائنات میں کسی اساسی خارجی یا معروضی حقیقت کی جستجو میں معلوم ہوا ہے کہ کوئی خارجی حقیقت اگر سرے سے ہو بھی تو وہ کوئی ایسی

نہایت ہی عجیب و غریب شے ہو گی جو کبھی خواب و خیال میں بھی نہ آتی تھی۔
ایڈنگٹن نے نظریۂ اضافیت کے ضمن میں لکھا ہے کہ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو طبیعات کی ایک دوسری جدید ترقی کوانٹم تھیوری تک پہنچ کر ہم نے خارجی حقیقت کی جستجو کے مقصد کو ترک کر دیا ہے اور طبعی کائنات کی ایسے عناصر میں تحلیل کرنا پڑی ہے جو صراحۃً ذہنی (SUBJECTIVE) ہیں، اگر خارجی دنیا کو جاننے میں ہمارے لئے خود اپنے ذہنی عنصر کو جدا کرنا مشکل ہے تو خود ان (SELF KNOWING) شعور کے مسئلہ میں جہاں ذہن خارج (یعنی جاننے والا اور جانا گیا) حقیقۃً ایک ہو جاتے ہیں اس کو جدا یا ممتاز کرنا کہیں زیادہ مشکل ہو گا ——— (ماڈرن بلیف)

غرض فلسفہ کے بعد سائنس میں بھی ہوا کا رُخ جس طرح تصوّریت یعنی اس خیال کی طرف جا رہا ہے کہ ہماری کائنات اور اس کی نیرنگیاں بے شعور مادہ کی میکانکی کارستانیاں نہیں بلکہ ذہن و شعور کی کارفرمائیاں ہیں۔ اور کچھ سائنس دان نہ سہی لیکن سائنس دان فلسفی کی حیثیت سے سرجیمس، جیانس، ماکس، پلانک، شروڈنگر اور آئن سٹائن وغیرہ جیسے رجال سائنس کا تصوّریت کی جانب رجحان بڑھتا جا رہا ہے اور کائنات کا اساسی سرچشمہ شعور کو قرار دینے لگے ہیں۔ جیسا کہ سرجیمس جینز کا صاف اعتراف ہے کہ میرا رجحان تصوّریہ کے اسی نظریہ کی طرف ہے کہ اساسی و بُنیادی حقیقت شعور ہے اور مادی کائنات اس سے ماخوذ ہے

— (ماڈرن بلیف ص ۵۲۰) —

مذاہب کا وجود اسی ذی شعور و ذی علم اساسی سرچشمۂ کائنات کے سوا کیا ہے اور جب ساری کائنات ہی کسی نہ کسی طرح اس کے علم و شعور سے ماخوذ یا اس کی مخلوق ہے تو خرقِ عادت کے مادی یا میکانکی عوامل و قوانین کی جستجو خود عقل کی رُو سے کون سی عقلمندی کا کارنامہ ہے ———

قوانینِ فطرت میں اللہ کی مداخلت

انگلستان کے مشہور منطقی ولیم اسٹال جیونس نے ایک نہایت ضخیم کتاب "اصولِ سائنس"[۱] کے نام سے لکھی ہے جس میں آخری نتیجہ یہ نکالا ہے ——

" اُوپر علم سائنس کی حقیقت و نوعیت کے متعلق جو بحثیں گزری ہیں ان سے ایک نتیجہ جو نہایت صاف طور پر نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کارخانۂ فطرت میں مداخلت خداوندی کے امکان کو کسی طرح باطل نہیں ٹھہرا سکتے، جس قوّت نے کائنات مادی کو خلق کیا ہے وہ میرے نزدیک اس میں حذف و اضافہ بھی کر سکتی ہے۔ اس قسم کے واقعات ایک معنی کر کے ہمارے لئے قابلِ تصوّر کہے جا سکتے ہیں، پھر بھی یہ اس سے زیادہ ناقابلِ تصوّر نہیں جتنا کہ خود عالم کا وجود ہے"

مگر جو شخص اس خالقِ کائنات کی قوّت ہی کا قطعاً منکر ہُوا جو سرے سے غیب ہی پر ایمان نہ رکھتا ہو اور جو آرنسٹ ہیگل (جرمنی کا مشہور ملحد و مادہ پرست) کی طرح خود خدا، رُوح، حشر و نشر وغیرہ کو (معنی اوہام و خرافات) قرار دیتا ہو۔ تو ایسے آدمی کو آپ کسی معجزہ کا اس معنی میں کیونکر یقین دِلا سکتے ہیں کہ وہ کسی غیبی قوّت کا آفریدہ ہے۔ یا جس شخص سے وہ ظاہر ہُوا ہے، اس کے عالمِ غیب کے ساتھ رابطہ و تعلّق (نبُوّت) کی آیت یا نشانی ہے ——؟

قوانینِ فطرت میں خُدا کی مجبُوری،

اصل یہ ہے کہ حکمائے فلاسفہ نے ارسطو کی تقلید کی ہے اور مسئلہ علّت میں تمام تر مشائیہ کے نظریہ کو قبول کر لیا ہے کہ ذاتِ واجب الوجود علّتِ اولیٰ یا عقلِ اوّل کی علّتِ تامہ ہے اور علّتِ تامہ سے معلول کا تخلف نہیں ہوتا اور اضطراراً اس سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اس میں اس کے

[۱] THE PRINPEPLE OF SCIENCE —— (حاشیہ) طبع آخر ۱۹۱۳ء، ص ۷۶۶

ارادہ اور قصد کو دخل نہیں ہوتا، اس کی صحیح مثال آفتاب اور روشنی کی ہے کہ آفتاب کی روشنی علّتِ تامہ ہے جب آفتاب نکلے گا روشنی کا ظہور ہوگا۔ خواہ وہ موانع کی وجہ سے نظر نہ آئے اور آفتاب سے اس روشنی کا صدور آفتاب کے قصداً و ارادہ سے نہیں ہے بلکہ اس سے مجبوراً اور اضطراراً یہ روشنی پیدا ہو رہی ہے۔ عقلِ اوّل کے پیدا ہونے کے بعد عالمِ کائنات کا تمام کارخانہ باہمی سلسلۂ علل و معلول سے خود بخود پیدا ہونے لگا اور تمام عالم ایک ایسے نظام میں بندھ گیا کہ اب خالقِ اوّل کو اس دست اندازی کی مطلق قدرت ہی نہیں ــــ ظاہر ہے کہ اس مذہب کا پیرو سلسلۂ علل و معلول کو نہیں توڑ سکتا اور اس لئے وہ خرقِ عادت کو بھی تسلیم نہیں کر سکتا، لیکن تجربہ اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جن کی توجیہ ظاہری سلسلۂ علل و معلول سے نہیں ہوسکتی اور نہ ان کے وقوع سے کوئی انکار کر سکتا ہے۔ اس لئے اس کو ایک طرف لامحالہ ان واقعات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے[1]۔ اور دوسری طرف چونکہ وہ خدا کو مضطر اور مجبور مان چکا ہے۔ اس لئے براہ راست ان واقعات کو اس کی طرف منسوب نہیں کر سکتا اور چونکہ بلا سبب اور بے علّت کے کوئی شے ہو نہیں سکتی۔ اس بنا پر اسباب و عللِ خفیہ کے سایہ کے سوا اس کو اور کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ مگر آپ نے اوپر دیکھ لیا کہ یہ سوچ بھی محفوظ نہیں اور خدا کو قادرِ مطلق مانے بغیر چارہ نہیں ــــ

---

[1] ــــ حکمائے اسلام میں مسئلہ خرقِ عادت کا سب سے بڑا منکر بوعلی سینا اشارات میں لکھتا ہے۔

ولکنھا تجارب لما ثبت طلب اسبابھا ثم انی لوا قتفیت جزئیات ھذا الباب فیما شاھدناہ و فیما حکی عمن تناہ لطال الکلام ــــ

لیکن یہ تجربے ہیں جب وہ ثبوت کو پہنچ گئے تو اُن کے اسباب کی تلاش ہوئی اور اگر اس قسم کے جزئیات کا متبع کریں جو ہم نے خود مشاہدہ کیا یا ان کے لوگوں سے جن کو ہم معتبر سمجھتے ہیں سُنا ہے تو بہت طول ہو جائے گا۔

خرقِ عادت سے انکار کا اصلی سبب سلسلۂ اسباب وعلل پر یقین ہے۔

الغرض! خرقِ عادت سے صرف اس فریق کو انکار ہے جو یا خدا کا قطعاً منکر ہے یا یہ کہ وہ خدا کو قادر و ذی ارادہ نہیں مانتا اور ناقابلِ شکست سلسلۂ علل و معلول کے گورکھ دھندے پر یقینِ کامل رکھتا ہے۔ اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ تمام نظمِ کائنات باہمی تاثیر و تاثر کا نتیجہ ہے، غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس مذہب کے پیرو اپنے اس عقیدۂ باطل کے ضمن میں چند اور موہوم باتیں کو بھی بلا دلیل تسلیم کئے بیٹھے ہیں اور اس لئے خرقِ عادت کے قبول کرنے کی ان کو جرأت نہیں ہوتی ——

سلسلۂ اسباب وعلل پر علمِ انسانی کو احتوا نہیں

(۱) گویا انہوں نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ کائنات کے جو علل اور اشیاء، کے جو خواص انہوں نے دریافت کر لئے ہیں وہ نظامِ کائنات کے چلانے کے لئے کافی ہیں، اس کیلئے کسی اور کے دست اندازی کی ضرورت نہیں ——

(۲) کائنات کے چہرۂ اسرار کو انہوں نے تمام تر بے نقاب کر لیا ہے اور ہر شے کی علّت اور خاصیّت انہوں نے دریافت کر لی ہے ——

حالانکہ انسانی معلومات اس کے مجہولات کے مقابلہ میں بہت کم حیثیت ہیں اس فضائے کائنات کی بے شمار آبادیوں میں ذہن نام ایک آبادی کے چوتھائی خشک حصّے کے بعض اجزاءِ کائنات تک فقط ان کی رسائی ہو سکی ہے۔ اس مبلغِ علم پر اتنا عظیم الشان دعویٰ کسی طرح زیب نہیں دیتا، جن چیزوں تک ان کی رسائی ہوئی بھی ہے ان کے متعلق جو کچھ انہیں معلوم ہوا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ یہ چیز اس طرح چل رہی ہے۔ لیکن یہ حقیقت کہ وہ کیوں چل رہی ہے اور اگر اس کے خلاف چلے تو کیا استحالہ لازم آئے گا، ایک معمّہ ہے

اور ہمیشہ معمّہ رہے گا۔ اجرامِ فلکیہ اور طبقاتِ ارضیہ کو چھوڑ دو کہ وہ دُور ہیں۔ تم یہ کہتے ہو کہ بجلی میں یہ قوّت ہے۔ سنکھیا میں یہ اثر ہے، مقناطیس کا یہ خاصہ ہے، لیکن یہ بھی معلوم ہے کہ کیوں ایسا ہے۔ اور نزدیک آؤ، اپنے جسم کی دُنیا کو دیکھو، تم صرف یہ جانتے ہو کہ سانس کی آمد و رفت ہمارے پھیپھڑوں کی حرکت سے ہے۔ نبض کی رفتار، قلب کی قبض و بسط کی ڈوری سے وابستہ ہے، تمہارا نفس یا ذہن لمحوں میں ہزاروں میل کی خبر لیتا ہے۔ اور خدا جانے عجائباتِ نفسانی کے کیا کیا کرشمے دِکھاتا ہے لیکن کوئی یہ حل کر سکا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ دل کو کس نے مضطرب بنا رکھا ہے۔ پھیپھڑوں کی دھونکنی کس طرح روز و شب مصروفِ عمل ہے، دماغ کے ذہنی افعال کیونکر سرانجام پاتے ہیں، جب اتنے قریب کی چیز تمہارے فلسفہ علل و اسباب کے دائرہ سے باہر ہے تو دُور دراز کی اشیاء کی نسبت تمہارا دعویٰ علم کس قدر تمسخر انگیز ہے۔ سائنس دان اعلانیہ اعتراف کرتے ہیں کہ وہ صرف "کیسے" کا جواب دے سکتے ہیں "کیوں" کا جواب ان کے موضوعِ بحث سے خارج ہے۔ فلاسفہ کا یہ حال ہے کہ وہ فلسفی بھی ایک نظامِ خیال پر متفق نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ علاّمہ ابنِ تیمیہؒ نے الردعلی المنطقین میں لکھا ہے:

" فلاسفہ کوئی ایک متحد الخیال جماعت نہیں جس کا علم الٰہیات و طبیعات وغیرہ میں کوئی ایک مذہب ہو، بلکہ وہ مختلف فرقے ہیں اور ان کے اندر آراء اور خیالات کا اتنا اختلاف ہے کہ ان کا احاطہ بھی مشکل ہے، ان کے باہمی اختلافات تو اس سے بھی زیادہ ہیں جس قدر کسی ایک آسمانی مذہب کے مختلف فرقوں کے اندر ہیں ــــ"

اس اختلافِ رائے اور اس خیال کی بناء پر کسی فلسفی کا یہ دعویٰ کہ مذہب کا فلاں مسئلہ فلسفہ کے خلاف ہے اس لئے ناقابلِ قبول ہے۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ یہ مسئلہ ہماری جماعت کی رائے کے خلاف ہے اس لئے ناقابلِ تسلیم ہے۔ تو یہ مذہب ہی پر کیا موقوف ہے، ہر نظامِ فلسفہ کا قائل دوسرے نظامِ فلسفہ کے بطلان پر اسی قدر قوّت سے اس استدلال

کام میں لا سکتا ہے، غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ فلسفہ کے جس قدر فرقے (اسکول) اور نظامات (سسٹم) ہیں، درحقیقت وہ اسرار کائنات کے متعلق ایک مرتب خیال کی کڑیاں ہیں۔ ان مرتّب خیال کی کڑیوں کو مان کر جس کے نفس کی تسکین ہو جاتی ہے وہ ان کا فلسفہ ہے۔ اسی طرح مذہب بھی اپنا ایک نظام خیال رکھتا ہے اور جو لوگ اس نظام خیال پر یقین رکھتے ہیں ان کی اس سے تشفی ہو جاتی ہے، ایسی حالت میں اگر معجزہ کا امکان یا وقوع کسی نظام خیال کے خلاف ہے تو نفس کا یہ اختلاف اس کے ابطال کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ یہ لازم آئے گا کہ ہر فلسفیانہ مسئلہ اس لئے باطل ہے کہ دوسرے نظام فلسفہ کے وہ خلاف ہے ——

نظام عالم کے چلانے کے لئے علل واسباب کے کافی ہونے کے فلسفہ پر یقین رکھنے کیلئے سب سے پہلی بحث آغاز آفرینش کی آتی ہے، آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ شے اس سبب سے پیدا ہوئی اور اس شے کی پیدائش کا سبب یہ ہے۔ لیکن کیا کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ یہ مادہ کہاں سے آیا؟ اور اس کے حدوث کا سبب کیا ہوا؟ عناصر کیونکر اور کیوں وجود میں آئے۔ یہ نوع بنوع چیزیں کیونکر بن گئیں؟ ہمارے جواب میں ان نظریات کا ذکر نہ کیجئے، جن کا نام اصولِ ارتقاء اور انتخاب طبعی وغیرہ ہے کہ ان کی علمی حیثیّت مفروض اور وہمیات سے زیادہ نہیں اور ان کی اخیر سرحد بالآخر لاعلمی اور جہالت پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ مادہ کی ابتدائی بُنیاد چاہے اربع عناصر کو بتائیے یا جواہر فردہ کو یا سالمات کو یا ایتھر کو یا برق پاروں کو یا جن کو بھی بتاؤ لیکن ان کے حدوث کی علّت نہیں بتائی جا سکتی اور نہ بتا سکتے ہیں کہ بالآخر وہ کہاں سے آئے؟ اب تو حیوانات نطفہ سے، پرندے انڈے سے اور درخت گٹھلی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور بغیر ان کے ان کا پیدا ہونا ناممکن سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ کوئی بتا سکتا ہے کہ دُنیا کا پہلا حیوان، پہلا پرندہ اور پہلا درخت کسی نطفہ، کسی انڈے اور کسی گٹھلی سے پیدا ہُوا یا نہیں؟ اگر ہاں کہتے ہیں تو آپ نے اپنے دعوٰے کے خلاف ایک شہادت قبول کر لی اور اگر انکار کرتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ پہلا نطفہ، پہلا انڈہ اور پہلی گٹھلی

انسان پرندہ اور درخت کے بغیر پیدا ہوئی، غرض اس گتھی کو آپ اپنے ناخن ہمّت سے کس طرح سُلجھا سکتے نہیں اور ناچار آپ کو سلسلۂ علل واسباب کے مذہب سے برگشتہ ہونا پڑے گا ——

حقیقی علت خُدا کی قُدرت اور ارادہ ہے

جہاں آپ اپنے سلسلۂ اسباب وعلل کو چند قدم بڑھا سکتے ہیں وہاں بھی بالآخر سپر افگن ہونے سے چارہ نہیں۔ پانی بادل سے برسا، بادل بُخارات سے بنے، بُخارات پانی سے اُٹھے جو سُورج کی تپش سے گرم ہو کر یہ صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ غرض پانی بُخارات سے پیدا ہُوا اور بُخارات پانی سے پیدا ہوئے۔ اس دَور کے عقدۂ لاینحل کو آپ حل کر سکتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے اور اس کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ ایک قادر و ذی ارادہ ہستی کو تسلیم کیجئے جس کی مشیت اور ارادہ سے سارا کارخانہ چل رہا ہے۔ اسباب وعلل صرف اس کی مشیت و ارادہ کے مظاہر ہیں اور اپنی عادت کے مُطابق ایک طریق خاص پر اس کو چلا رہا ہے لیکن وہ اس کا پابند نہیں، صدیوں میں جب اس نے ضرورت سمجھی انسانوں میں اپنا ایک نشان قائم کرنے کے لئے عادت کے خلاف کوئی بات ظہور پذیر کر دی، علّت اور معلولیت کا تعلّق جو بظاہر نظر آتا ہے ہم نے اس کی عادت جاریہ کی یک رنگی اور یکسانی سے اس کو سمجھ لیا ہے کہ اگر اس کی عادت جاریہ یکرنگی اور یکسانی اختیار نہ کرتی تو مخلوقات اپنے منافع کے حصول اور مضرتوں کے دفع کے لئے پہلے سے کوئی تیاّری نہ کر سکتیں۔

علت و خاصیّت اور اس کی حقیقت

اس اجمال کی تفصیل علت، خاصیت اور اثر کی تحقیق پر مبنی ہے اور اشیاء میں جو خواص اور آثار ہیں ان کا علم ہم کو کیونکر ہوتا ہے، محض تکرار احساس سے جس کا دوسرا نام

تجربہ ہے ــــــ

جب ہم آگ کے پاس جاتے ہیں تو گرمی اور سوزش کا احساس کرتے ہیں اور پھر جب، جب ہم آگ کے پاس گئے تو ہم کو اسی قسم کا احساس ہوتا رہا۔ اس سے ہمیں یہ یقین پیدا ہوا کہ آگ کا خاصہ اور اثر گرمی اور سوزش ہے۔ فرض کرو کہ اگر تکرارِ احساس سے اور یہی تجربہ ہم کو برف سے حاصل ہو جائے تو یقیناً ہم کہہ دیں گے کہ برف کی خاصیت سوزش اور گرمی ہے۔ برف اور آگ دونوں آپ کے سامنے ہیں، دونوں کو اچھی طرح غور سے دیکھئے، کیا ان کی ذات میں کوئی ایسی چیز نظر آتی ہے جس کی بناء پر احساس بلکہ تکرارِ احساس سے قبل آپ یہ فیصلہ کر دیں کہ ایک میں گرمی اور دوسرے میں ٹھنڈک کا ہونا ضروری ہے ــــــ

آپ کے ہاتھ میں کوئی شخص کافور اور سنکھیا کی تھوڑی تھوڑی مقدار لا کر رکھ دیتا ہے اس سے پہلے آپ ان چیزوں سے واقف نہ تھے، اب آپ دونوں کو غور سے دیکھئے اور خوب اُلٹ پلٹ کر دیکھئے، سونگھ کر، چکھ کر، چھو کر کس طرح آپ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کے خواص و آثار کیا ہیں؟ فیصلہ ناممکن ہے جب تک اُن کا بار بار تجربہ نہ کیا جائے اور ہر بار کے عمل سے ایک ہی نتیجہ ظاہر نہ ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ اشیاء کے خواص اور آثار کا علم صرف یکسانی عمل اور تجربہ پر موقوف ہے ــــــ

عمل کی اسی یکسانی اور تجربہ کی بناء پر ہم علل و معلولات اور اسباب و مسبّبات کا مسئلہ قائم کرتے ہیں اور اسی کی بناء پر مدعیانِ عقل و دانش وہ صنم کدہ قائم کرنا چاہتے ہیں جس کے پرستاروں کے نام نیچری، میٹریلسٹ، مادہ پرست، فطرت پرست اور طبعی ہیں وہ جب ایک شے سے ایک ہی عمل اور اثر کا بار بار تجربہ کرتے ہیں تو یقین کر لیتے ہیں کہ اُس شے سے اس خاصیّت و اثر کا انفکاک قطعاً محال ہے اور جب ایک شے کے بعد فوراً دوسری شے معلول و مسبّب اور پہلی شے علّت و مسبّب ہے اور یہ کلیہ قائم کر لیتے ہیں کہ گرمی اور سوزش کا سبب آگ ہے۔ ٹھنڈک اور برودت کا سبب برف ہے۔

موت کا سبب سنکھیا ہے ــــــــ

یا یوں کہیئے، کہ آگ کا خاصہ جلانا۔ برف کا خاصہ ٹھنڈا کرنا، سنکھیا کا خاصہ انسان کی زندگی کو ختم کر دینا ہے ــــــــ

اسباب و علل محض عادی ہیں

لیکن ابھی ثابت ہو چکا کہ ہم جن کو آثار و خواص یا اسباب و علل کہتے ہیں محض اس تجربہ پر ان کی بنیاد ہے کہ ہم نے ہمیشہ اس شے کو ہوتے دیکھا ہے اور اس سے یہ توقع یا زیادہ سے زیادہ ظن غالب یہ پیدا ہوتا ہے کہ آئندہ بھی جب یہ شے پیدا ہو گی تو اس کے بعد دوسری شے پیدا ہو جائے گی لیکن اس سے یہ یقین کیسے پیدا ہو سکتا ہے کہ ہم نے جو کچھ مشاہدہ کیا ہے وہ پہلے بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہوتا رہے گا ــــــــ

اسباب و علل کا علم بدلتا رہتا ہے

اسی طریق پر اشیاء اور موجودات عالم سے عادۃً جو مختلف آثار و نتائج کا صدور ہوتا رہتا ہے، اس لئے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم ان اشیاء اور موجودات سے ان آثار و نتائج کے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں اور عادتاً ایسا سمجھتے ہیں کہ آئندہ بھی ان سے یہی آثار و خواص صادر ہوں گے ــــــــ

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمثیل صحیح نہیں ہے، لیکن ایک صاحب ارادہ ہستی ہے اس لئے اس کے افعال اس کے ارادہ کے ماتحت ہیں جن کو وہ جب چاہے بدل سکتا ہے ــــــــ

فلاسفہ اور قوانینِ فطرت

فلاسفہ اور حکماء کی وہ جماعت قوانینِ فطرت کے ناقابلِ شکست ہونے پر ایمان رکھتی ہے۔ اور اس بناء پر خوارق سے قطعی انکار کرتی ہے۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ گو

خود ان فلاسفہ کا اصل عقیدہ یہی ہے کہ وہ متعدد ایسے اصول تسلیم کرتے ہیں جن کی بنا، پر خوارقِ فطرت کا تسلیم کرنا ان کے لئے لازم ہو جاتا ہے۔ مثلاً :۔

ا ۔۔۔ وہ " تولد ذاتی " کے قائل ہیں یعنی کہ یہ کہ جن جانداروں کی پیدائش ایک نظامِ خاص کے ساتھ ہوتی ہے۔ ایک قطرۂ آب سے خون، خون سے گوشت، پھر بتدریج مدّتِ حمل کے اندر وہ شکمِ مادر میں پرورش پاتے رہتے ہیں۔ ایک متعیّن زمانہ کے بعد وضعِ حمل ہوتا ہے، پھر شیر خوارگی اور بچپن کے دَور سے آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے ایک تنومند، قوی ہیکل، ذی رُوح صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ دفعتاً ان بیچ کے منازل کو طے کئے بغیر اس ہیکل اور صورت میں نمودار ہو جائیں ۔۔۔۔

یہ فلاسفہ کہتے ہیں کہ قطرۂ آب کے زمانہ سے لے کر اس عالمِ شباب کے عہد تک اس مجموعہ عناصر کو جو سالہا سال سے صرف کرنا پڑے، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان عناصر میں حیات کی قابلیت پیدا ہونے کے لئے ایک خاص قسم کے اعتدالِ ترکیب کی ضرورت تھی، جب ترکیب میں یہ اعتدال پیدا ہُوا، حیات پیدا ہو گئی، اس بنا، پر اگر کسی مجموعہ عناصر میں اس قسم کا اعتدال پیدا ہو جائے جس میں حیاتِ انسانی کے قبول کی صلاحیت ہو تو بغیر نطفہ حمل خون گوشت، وضعِ حمل، شیر خوارگی، بچپن وغیرہ درمیانی وسائط طبعی کے۔ اچھا خاصا ایک نوجوان مٹی کے پُتلہ سے بن کر کھڑا ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ برسات میں اکثر کیڑے مکوڑے سڑی گلی مٹی میں ایک خاص اعتدالی کیفیّت پیدا ہو جانے سے جاندار اور ذی رُوح بن جاتے ہیں۔ اسی کا نام "تولد ذاتی" ہے ۔۔۔۔

اسی تفصیل کی بنا، پر ان کے نزدیک یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ذی رُوح کی پیدائش کے لئے دُنیا میں جو سلسلہ اسباب عادۃً جاری ہے، ۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کے خلاف ہو سکتا ہے تو پھر عصا سانپ بھی ہو سکتا ہے، مُردے زندہ بھی ہو سکتے ہیں۔ پہاڑ سونا بھی ہو سکتا ہے۔ ایک عصا کے سانپ بن جانے کی فطری صورت یہ ہے کہ پہلے

وہ سڑ گل کر مٹّی ہو جاتا ہے وہ مٹّی ایک غذا کی صورت میں ایک سانپ کے اندر جاتی ہے اور پھر وہ غذا دوسری شکل میں بن کر سانپ کا بچّہ بن جاتی ہے۔ تولّد ذاتی کے اصول پر یہ ممکن ہے کہ بیچ کے وسائط کے بغیر عصا میں سانپ بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے

۲ — یہ ظاہر ہے کہ دُنیا میں جو کچھ حوادث ہوتے ہیں وہ کسی نہ کسی حیثیت سے مادّہ (ہیولیٰ) ہی کے تغیرات کے نام ہیں، مادہ (ہیولیٰ) اس تمام عالم عنصری کا ایک ہی ہے اس بناء پر عالم میں انواع اشکال اور خواص کے یہ لاکھوں اور کروڑوں تنوعات اور اختلافات جو ہم کو نظر آتے ہیں، ان کا سبب مؤثر اگر بالفرض خود مادّہ ہی ہوتا تو ضروری تھا کہ تمام دُنیا میں ایک ہی شکل اور ایک ہی خاصیّت ہو۔ تو تم کہو گے کہ یہ اختلاف و تنوع مادّہ کے اختلاف استعداد سے پیدا ہوا لیکن استعداد تو تاثر اور انفعال کا نام ہے۔ علّتِ فاعلہ اور سببِ مؤثر کیا ہے؟ فلاسفر کہتے ہیں کہ اجرامِ فلکیہ کی گردش اور رفتار ہے۔ مگر اس کے ساتھ وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اجرام فلکی کی اس گردش و رفتار اور اختلافِ اشکال کی نہ کوئی حد و نہایت ہے اور نہ کسی قانونِ فطری کے ماتحت ہیں اور نہ ان کا علم ہم کو ہو سکتا ہے۔ تو اس اصول کے صحیح باور کر لینے پر عجائبِ قدرت اور خوارقِ فطرت کی وہ کون سی مثال ہے جس کے محال ہونے کا وہ دعویٰ کر سکتے ہیں۔

۳ — عالم میں جو کچھ ہوتا ہے یا تو وہ کسی سبب مؤثر کی بناء پر ہوتا ہے، یا بلا سبب مؤثر کے ہوتا ہے اور دونوں صورتوں میں خرقِ عادت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اگر یہ کہیئے کہ یہ حوادث بلا سبب مؤثر کے وجود پذیر ہوتے ہیں۔ تو گویا آپ نے خود خرقِ عادت کو تسلیم کر لیا، پھر دُنیا میں کوئی عجیب سی عجیب اور مستبعد سے مستبعد بات بھی ناممکن نہیں رہتی اور اگر یہ کہیئے کہ یہ سببِ مؤثر کے نتائج ہیں تو دو حال سے خالی نہیں۔ یا یہ سببِ مؤثر صاحبِ اختیار و ارادہ ہے اور یہ تمام حوادث و تاثیر اس کے ارادہ و اختیارات سے صادر ہوتے ہیں یا وہ بے اختیار اور مسلوب الارادہ ہے اور یہ حوادث

تاثیرات اس سے اسی طرح بے ارادہ اور اضطرارانہ طبعی طور سے سرزد ہوتے ہیں جس طرح سورج سے روشنی، آگ سے گرمی، برف سے ٹھنڈک، پہلی صورت میں معجزانہ اور خوارق کے صدور میں کوئی استحالہ نہیں، کیونکہ اس مدبر و مؤثر کا جب جیسا ارادہ ہو وہ شے اسی طرح واقع ہوگی کوئی اس کا مانع نہیں ——— دوسری صورت میں ظاہر ہے کہ یہ تمام تاثیرات اس بے ارادہ مؤثر عالم سے زمانۂ قدیم سے ایک ہی طور سے سرزد ہوتی چلی آتی ہے جیسے آفتاب سے روشنی ایسی حالت میں ایک عام واحد قدیم وازلی سبب و مؤثر سے یہ ہر نئے آن اور نئے لمحہ میں نئی نئی اور مختلف شکل وصورت اور خواص کی اشیا کیونکر ظہور پذیر ہوتی ہیں ؟ آپ کہیں گے کہ علّت تو بے شک واحد قدیم ہے مگر علّت کے وجود کے ساتھ معلول میں بھی تو استعداد اور قبولیت کا مادہ پیدا ہونا چاہیئے۔ مادہ میں یہ استعداد و صلاحیت گردش فلکی کے مختلف اشکال کا نتیجہ ہے ———

لیکن ابھی کہا جا چکا ہے کہ آپ کے نزدیک اشکالِ فلکی کی نہ تو کوئی حد و پایاں ہے اور نہ وہ کسی خاص قاعدہ اور اصول کے اندر محدود ہیں۔ اس بناء پر حوادثِ عالم کے اختلاف اور نیرنگی کا باعث اگر گردشِ فلکی کا اختلاف اور نیرنگی ہے تو ایسی صورت میں یہ کیوں نہیں ممکن ہے کہ جو چیز آپ کو بظاہر خلافِ فطرت اور خلافِ عادت معلوم ہوتی ہے وہ کسی خاص شکل فلکی کا نتیجہ ہو ——— (مطالبِ عالیہ، از امام رازیؒ)

(ترتیب از عبدالباری ندوی بحث معجزہ سیرۃ النبیؐ)

اصولِ تعلیل کی موت

آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت کہتا ہے کہ کشش ثقل سیاروں، ستاروں کہکشاؤں اور خود کائنات کے عمل کو کنٹرول کرتی ہے۔ یہ عمل اس طرح ہوتا ہے کہ اس کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے ——

اس سائنسی دریافت کو ہیوم (۱۷۷۶ - ۱۷۱۱) اور دوسرے مفکّرین نے فلسفہ بنایا انہوں نے کہا کہ کائنات کا سارا نظام اصولِ تعلیل (PRINCIPLE OF CAUSATION) پر چل رہا ہے جب تک اسباب وعلل کی کڑیاں معلوم نہیں تھیں انسان یہ سمجھتا رہا کہ کائنات کو کنٹرول کرنے والا ایک خدا ہے مگر اب ہم کو اسباب وعلل کے قوانین کا علم ہو گیا ہے۔ اب ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ تعلیل (CAUSATION) کا مادّی اصول کائنات کو متحرک کرنے والا ہے نہ کہ کوئی مفروضہ خدا ——

مگر بعد کی تحقیقات نے اس مفروضہ کا خاتمہ کر دیا۔ بعد کو ڈیراک، ہیزن برگ اور دوسرے سائنس دانوں نے ایٹم کے ڈھانچہ کا مطالعہ کیا —— انہوں نے پایا کہ ایٹم کا نظام اس اصول کی تردید کر رہا ہے کہ جو شمسی نظام کے مطالعہ کی بُنیاد پر اختیار کیا گیا تھا —— اس دوسرے نظریہ کو کوانٹم نظریہ کہا جاتا ہے۔ اور وہ مذکورہ اصولِ تعلیل کی کامل تردید ہے:——

The quantum Mechanics theory Mantains That at the ATOmic Level; Matter behaves Randomly

کوانٹم میکنکس کا نظریہ کہتا ہے کہ ایٹم کی سطح پر مادّہ غیر مرتّب انداز میں عمل کرتا ہے ——

سائنس میں کسی "اصول" کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ سارے عالم میں یکساں طور پر کام کرتا ہو۔ اگر ایک معاملہ بھی ایسا ہو جس پر وہ اصول چسپاں نہ ہوتا ہو تو علمی طور پر اس کا مسلّمہ اصول ہونا مشتبہ ہو جاتا ہے، چنانچہ جب یہ معلوم ہوا کہ ایٹم کی سطح پر مادہ اس طرح عمل نہیں کرتا جس کا مشاہدہ نظام شمسی کی سطح پر کیا گیا تھا تو تعلیل بحیثیت سائنسی اصول کے رد ہو گیا۔

آئن سٹائن کو یہ بات ناقابلِ فہم معلوم ہوئی، کیونکہ اس طرح کائنات مادّی کرشمے کے بجائے ارادی کرشمہ قرار پا رہی تھی۔ اس نے اس مسئلہ پر باقاعدہ تحقیق شروع کی۔ اپنی زندگی کے آخری تیس سال اس نے کوشش میں صرف کر دیئے کہ نظام فطرت میں اس "تضاد" کو ختم کرکے شمسی نظام اور ایٹمی نظام دونوں کے عمل کو ایک قانون کے تحت منظّم کر سکے۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا یہاں تک کہ بالآخر ناکام مر گیا ——

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا بیان کائنات کو پکڑے ہوئے ہے۔ شمسی نظام کی سطح پر حرکت کا مطالعہ کرکے انسان نے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں یہ رائے قائم کر لی کہ اس کی حرکت معلوم مادّی اسباب کے تحت ہو رہی ہے۔ یہ با اختیار خدا کے قرآنی تصوّر کی گویا تردید تھی۔ مگر علم کا دریا جب آگے بڑھا تو دوبارہ قرآن والی بات غالب آ گئی۔ بیسویں صدی میں ایٹمی نظام کے مطالعہ نے بتایا کہ ایٹم کی سطح پر اس کے ذرّات کی حرکت کا کوئی معلوم قاعدہ نہیں ——

ایک سائنس دان اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"طبیعیات کے قوانین جو زمین پر دریافت کئے گئے ہیں وہ تحکمی شمار پر مشتمل ہیں۔ جیسے الیکٹران کی مقدار مادّہ کا تناسب ایک پروٹان کے مقدار مادّہ سے جو کہ تقریباً ۱۸۴۰ کے مقابلہ میں ایک ہوتا ہے۔ کیوں۔ کیا ایک خالق نے تحکمی طور پر انہیں بے شمار کا انتخاب کر رکھا ہے" —— (سنڈے ٹائمز لندن، ۲۸ دسمبر ۱۹۷۵ء) ——

یہ الفاظ سائنس کی زبان سے اس بات کا اعتراف ہیں کہ کائنات انسانی علم کے احاطہ میں نہیں آتی۔ کائنات ایک قادر مطلق خدا کی مرضی کا ظہور ہے اور خدا کی مرضی کے تصوّر کے تحت ہی اس کی واقعی توجیہہ کی جاسکتی ہے ـــــ

(عظمتِ قرآن از وحید الدین خان)

نظریۂ ارتقاء کی تردید ،

اس کی ایک مثال حیاتیاتی ارتقاء کا نظریہ ہے۔ ڈارون (۱۸۸۲ - ۱۸۰۹) اور دوسرے سائنسدانوں نے دیکھا کہ زمین پر جو مختلف انواع حیات موجود ہیں۔ ان میں ظاہری اختلافات کے باوجود حیاتیاتی نظام کے اعتبار سے کافی مشابہت پائی جاتی ہے مثلاً گھوڑے کا ڈھانچہ اگر کھڑا کیا جائے تو وہ انسان کے ڈھانچہ سے ملتا جلتا نظر آئے گا ـــ اس قسم کے مختلف مشاہدات سے انھوں نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ انسان کوئی علیحدہ نوع نہیں۔ انسان اور حیوان دونوں ایک ہی مُشترک نسل سے تعلّق رکھتے ہیں۔ رینگنے والے جانور اور چوپائے اور بندر سب حیاتیات کے سفر ارتقاء کی پچھلی کڑیاں ہیں۔ اور انسان اس سفر ارتقاء کی اگلی کڑی ہے ــــــ

یہ نظریہ ایک سو سال تک انسانی ذہن پر حکمران رہا، مگر بعد کو مزید مطالعہ نے بتایا کہ وہ کائنات کے مجموعی نظام سے ٹکرا رہا ہے۔ وہ اس کے اندر درست نہیں بیٹھتا مثال کے طور پر سائنسی طریقوں کے استعمال سے اب یہ معلوم ہو گیا ہے کہ زمین کی عمر کیا ہے۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ تقریباً دو ہزار ملین سال پہلے زمین وجود میں آئی۔ یہ

یہ مُدّت ڈارون کے مفروضہ ارتقاء کو ظہور میں لانے کے لئے انتہائی حد تک ناکافی ہے۔ سائنسدانوں نے حساب لگا کر اندازہ کیا ہے کہ صرف ایک پروٹینی سالمہ کے مرکب کو ارتقائی طور پر وجود میں لانے کے لئے سنکھ مہا سنکھ ملین سال سے بھی زیادہ لمبی مدّت درکار ہے پھر صرف دو ہزار ملین سال میں زمین کی سطح پر مکمل اجسام رکھنے والے حیوانات کی دس لاکھ سے زیادہ قسمیں کیسے بن گئیں۔ اور نباتات کی دولاکھ سے زیادہ تکمیل یافتہ قسمیں کیونکر وجود میں آگئیں۔ اس قلیل مدّت میں تو ایک معمولی حیوان بھی نہیں بن سکتا۔ کُجا کہ مفروضہ ارتقاء کے مطابق لاتعداد مراحل سے گزر کر انسان جیسی اعلیٰ نوع ظہور میں آجائے ——

نظریہ ارتقاء حیاتیاتی عمل میں جن نوعی تبدیلیوں کو فرض کرتا ہے ان کے متعلق ریاضیات کے ایک عالم پاچو (Patau) نے حساب لگایا ہے۔ اس کے مطابق کسی نوع میں ایک چھوٹی سی تبدیلی کو مکمل ہونے کے لئے دس لاکھ پشتوں کی مُدّت درکار ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر مفروضہ ارتقائی عمل کے ذریعہ کُتّے جیسی نسل میں ان گنت تبدیلیوں کے جمع ہونے سے گھوڑے جیسا بالکل مختلف جانور بنے تو اس کے بننے میں کس قدر زیادہ لمبا عرصہ درکار ہوگا ——

اس مشکل کو حل کرنے کے لئے وہ نظریہ وضع کیا گیا جس کو پین سپرمیا (PAN-SPERMIA) کا نظریہ کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ زندگی ابتداءً زمین کے باہر بالائی خلا میں کسی مقام پر پیدا ہوئی اور وہاں سے سفر کر کے زمین پر آئی مگر تحقیق نے بتایا کہ اس کو ماننے میں اور بھی زیادہ بڑی بڑی مشکلیں حائل ہیں۔ زمین کے علاوہ وسیع کائنات کے کسی بھی ستارہ یا سیارہ پر وہ اسباب موجود نہیں جہاں زندگی جیسی چیز نشو ونما پا سکے، مثلاً پانی جو زندگی کے ظہور اور بقا کے لئے لازمی طور پر ضروری ہے۔ وہ اب تک کی معلومات کے مطابق زمین کے سوا کہیں اور موجود نہیں ——

پھر کچھ ذہین افراد نے فجائی ارتقاء (EMERGENT EVOLUTION)

کانظریہ وضع کیا۔ اس کے مطابق فرض کیا گیا کہ زندگی یا اس کی انواع بالکل اچانک پیدا ہو جاتی ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ محض ایک لفظ ہے نہ کہ علمی نظریہ۔ اچانک پیدائش کبھی اندھے مادّی قوانین کے ذریعہ ممکن نہیں۔ اچانک پیدائش کا نظریہ لازمی طور پر ایک مداخلت کرنے والے کا تقاضہ کرتا ہے۔ یعنی اس خارجی عامل کا جس کو نہ ماننے کے لئے یہ تمام نظریات گھڑے گئے ہیں ____

حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی توجیہہ ایک خالق کو مانے بغیر ممکن ہی نہیں۔ خالق کو چھوڑ کر دوسری جو بنیاد بھی تلاش کی جائے گی وہ کائنات کے نقشہ سے ٹکرا جائے گی۔ وہ اس کے ڈھانچے میں جگہ نہیں پا سکتی ____

پروفیسر جان مینار ڈاسمتھ نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ نظریہ ارتقاء ناقابلِ حل اندرونی مسائل (BUILT-IN PROBLEMS) سے دوچار ہے، کیونکہ ہمارے پاس نظریات ہیں مگر ہمارے پاس وہ ذرائع نہیں کہ ہم حقیقی واقعات سے اپنے نظریات کی تصدیق کر سکیں ____

قرآن کے مطابق انسان اور دوسری تمام انواع خدا کی تخلیق ہیں۔ اس کے برعکس نظریہ ارتقاء زندگی کی تمام قسموں کو اندھے مادّی عمل کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ قرآن کا جواب اپنی توجیہہ آپ ہے کیونکہ خدا ایک صاحبِ ارادہ ہستی ہے۔ وہ اسباب کا محتاج نہیں۔ وہ اپنی مرضی کے تحت کسی بھی واقعہ کو ظہور میں لا سکتا ہے۔ اس کے برعکس ارتقائی عمل کے لئے ضروری ہے کہ ہر واقعہ کے پیچھے اس کا کوئی سبب پایا جائے۔ چونکہ ایسے اسباب کی دریافت ممکن نہیں۔ اس لئے نظریہ ارتقاء اس دنیا میں بے توجیہہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ارتقاء کا نظریہ لازمی منطقی خلا سے دوچار ہے جب کہ قرآن کے نظریہ میں کوئی منطقی خلا نہیں پایا جاتا ____

(عظمتِ قرآن، از وحیدالدین خان)

وجودِ باری تعالیٰ اور عقلیات

سب سے پہلا سوال جس سے ہمیں سابقہ درپیش ہے وجود باری تعالیٰ کا ہے۔ فلاسفہ اور اہل سائنس نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے اور خصوصاً اس سے پچھلے دو تین سو سال میں تو موافق اور مخالف دلائل کا ایک طومار لگ گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے اہل فلسفہ کی ساری موشگافیاں انسان کی کوئی واضح رہنمائی کرنے میں قطعاً ناکام رہی ہیں۔ بقول اکبر:-

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

اس بحث میں اہل سائنس نے کچھ اور بھی تیکھے انداز سے شرکت کی، اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی کے مادیّت پرست سائنس دان اس دعوے کے ساتھ میدان میں اُترے کہ خدا کا کوئی وجود نہیں۔ لاپ لیس نے نظامِ شمسی پر اپنی کتاب میں خدا کا نام تک نہ لیا اور جب نپولین نے اس سے تعجب سے پوچھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ میں تمہاری کتاب میں خدا کا ذکر نہیں پاتا ہوں،، ـــــ تو اس نے کہا "حضورِ والا! ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ لے کچھ اور بڑھتی گئی اور بالآخر انیسویں صدی میں یہ کہا جانے لگا کہ سائنس نے خدا کے تصوّر کو ختم کر دیا ہے۔ کائنات کی ایک ایسی

توجیہ کردی ہے جس میں کسی مدبرِ اعلیٰ اور خالق کائنات کی ضرورت باقی نہیں رہی لیکن یہ ایک خام خیالی تھی اور حالات نے جلد ہی بتا دیا کہ انسان بہت سی آرا قائم کرنے میں بڑا جلد باز ہے —!

وجود باری تعالیٰ کے موضوع پر کسی بحث سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ خدا کا وجود حسّی اور مادّی نہیں ہے بلکہ مابعد الطبیعی ہے۔ عام طور پر کسی چیز کے وجود کو جاننے کیلئے ہمارے پاس جو ذرائع و وسائل ہیں وہ حواس ہیں۔ سائنس اپنا علم انہی حواس کے ذریعہ حاصل کرتی ہے۔ لیکن حواس سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ محض مادّی اور حسّی دُنیا تک محدود ہے۔ جو چیزیں ان سے ماورا ہیں، یعنی طبیعی کی بجائے مابعد الطبیعی ہیں، ان کو جاننے کے لئے حواس ناکافی ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حواس مجبور اور لاچار ہیں اور اس کے حقائق کو جاننے کے لئے حواس ہمارے معین و مددگار نہیں ہو سکتے، یہی وجہ ہے کہ خدا کے معاملے میں اس طرح کے دلائل طلب کرنا جو کسی دُنیا سے متعلّق ہوں یا جو اس کے معیار کے مطابق ہوں ایک غیر عقلی اور غیر سائنٹیفک مطالبہ ہے —

مادیّت پرست سائنس دان جس غلطی کا شکار ہوئے وہ یہ تھی کہ انھوں نے خود سائنس کی حدود کو نہ سمجھا اور اس زعم میں مُبتلا ہو گئے کہ سائنس زندگی کے ہر عقدہ کو حل کر سکتی ہے۔ جس طرح خشکی کی سواری پانی پر بے کار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح طبیعی دُنیا کا مطالعہ کرنے والی سائنس مابعد الطبیعی حقائق کا ادراک نہیں کر سکتی۔ سائنس اپنے مخصوص دائرہ میں بڑی مفید خدمت انجام دے رہی ہے۔ لیکن اس کے نام پر کسی ایسی دُنیا کی بات پیش کرنا جو اس کے دائرہ سے باہر ہے اور جس کے متعلّق وہ کوئی علم نہیں رکھتی ایک غیر سائنٹیفک بات ہے اور ایسے دعویٰ کی کوئی وُقعت نہیں ہوگتی، سائنس کی صورت یہ ہے کہ: —

۱ اس کا دائرہ کار حسی اور طبیعی دُنیا تک محدود ہے، اس سے باہر کے بارے

میں وہ خاموش ہے اور کچھ نہیں کہہ سکتی ـــــــ

۲ ـــ طبیعی دُنیا میں بھی سائنس کا مطالعہ جُزوی ہے ـــ کُلی نہیں۔ وہ ایک خاص پہلو یا جُزو کا مطالعہ کرتی ہے پُوری حقیقت کا اِدراک نہیں کر سکتی ـــــ

۳ ـــ اس کا طریقِ مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی ہے اور ایک خاص طریقِ عمل کے ذریعہ اس کی حاصل شدہ معلومات سے قوانین، نظریات اور طبیعی نظام کے بارے میں تصوّرات قائم کئے جاتے ہیں۔ یہ ساری معلومات ظنّی ہوتی ہیں۔ انہیں درجۂ یقین حاصل نہیں ہوتا۔ ابتدائی درجہ میں نسبتاً یقین کا عنصر سب سے زیادہ ہوتا ہے اور جُوں جُوں نظریات اور تعبیرات کا حصّہ بڑھتا جاتا ہے ظن و تخمین کا عنصر بھی بڑھتا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر ایک دَور کے سائنسی تصوّرات دوسرے دَور کے سائنسی تصوّرات کی تکذیب کر دیتے ہیں اور سر جیمس جینز کے بقول سائنس کا دریا اُلٹے رُخ پر بہنے لگتا ہے۔

۴ ـــ سائنس کے مختلف شعبوں کے حاصل کردہ نتائج ایک دوسرے سے متصادم بھی ہوتے ہیں، اکثر ایسا ہُوا ہے کہ فزکس اگر ایک سمت میں رہنمائی کرتی ہے تو بیالوجی ایک دوسری سمت میں اور سائیکالوجی ایک تیسری سمت میں۔ اس لئے کسی ایک کو سائنس کہنا اور دوسرے کو نظر انداز کر دینا غیر حقیقت پسندانہ رویّہ ہے ــــ

ـــــ ان وجوہ کی بناء پر یہ کہنا کہ سائنس خدا کے وجود کی نفی کرتی ہے ایک بے سرو پا اور غیر عقلی دعویٰ ہے۔ یہ سوال ہی سائنس کے دائرۂ کار سے باہر ہے۔ وہ اس کے بارے میں بجز خاموشی کے اور کوئی مؤقف اختیار نہیں کر سکتی۔ فرانسیسی سائنسدان پروفیسر لیتر نے سچ کہا ہے کہ :ـــــ

" کائنات کے آغاز و انجام تک مشاہدے کی رسائی نہیں ہے اس لئے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی اَزلی یا اَبدی وجود کا انکار کریں۔ جس طرح ہمارا کام یہ بھی نہیں ہے کہ ہم اس کو ثابت کریں۔ ہمارا کام نفی

واثبات دونوں سے الگ ہے ــــ"

یہ تو ہے فطری صورت، لیکن اگر خود سائنسی فکر کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی میں پُرانی سائنسی مادیّت کے خلاف ایک شدید ردِّ عمل رونما ہُوا ہے اور سائنس کا نیا رجحان مذہب اور خُدا کے وجود کے خلاف ہونے کے بجائے اسی سمت میں اشارہ کر رہا ہے۔ ایکس ریز کی دریافت سے سائنس میں جو نیا فلسفیانہ رجحان شروع ہُوا ہے اور نظریۂ اضافیت اور نظریۂ کوانٹم کے زیرِ سایہ جس نے پرورش پائی ہے وہ سائنس کو مذہب کے حقائق سے دُور لے جانے کے بجائے ان سے قریب تر لے آیا ہے، عام فضا کی یہ تبدیلی بڑی فکر انگیز ہے۔ ڈاکٹر لی کامتے ڈونوائے نے تو اپنی کتاب "تقدیرِ انسانیت" اس دعویٰ کے ساتھ پیش کی ہے کہ :ــــ

" اگر ہم سائنس کے جمع شدہ سرمایہ کا تنقیدی مطالعہ کریں اور اس سے منطقی اور عقلی نتائج مستنبط کریں تو یہ نتائج لازمی طور پر ہمیں خُدا تک لے آتے ہیں ــــ"

پروفیسر سولیوَن نے چوٹی کے سائنس دانوں کے افکار کا جو نچوڑ پیش کیا ہے وہ یہ ہے:ــ

" ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نئی دُنیائے سائنس میں مذہبی نقطۂ نظر بھی اتنی ہی حُجّت وصداقت کا حامل ہے جتنا سائنسی نقطۂ نظر۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس نئی سائنسی دُنیا کے سب سے بڑے ماہر (آئن سٹائن) کی نظر میں تو مذہبی فکر ہی سائنسی نقطۂ نظر کا ماخذ اور رہبر ہے ــ"

اور پروفیسر جوڈ یہاں کہہ گیا ہے کہ :ــــ

" سر جیمس جینز اور سر ارتھر ایڈنگٹن کی کتب ہمیں بتاتی ہیں کہ بیسویں صدی کی فزکس نے طبعی دُنیا کے بارے میں اُنیسویں صدی کے تصوّرات میں انقلاب برپا کر دیا ہے اور یہ انقلاب مذہب سے مصالحت اور

دوستداری کی سمت میں ہے۔ آج سائنس اور مذہب کائنات کی حقیقت کے بارے میں ایک ہی طرح کی بات کہہ رہے ہیں۔ گو اپنے نتائج تک پہنچنے کے لئے دونوں کے طریق ہائے تحقیق و مطالعہ جُدا جُدا ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج سائنس نے خُدا کے تصوّر کا اثبات کر دیا ہے[ل]۔"

جدید سائنسی فکر کے یہ رجحانات صحت مند ہیں اور ہوا کے نئے رُخ کا پتہ دیتے ہیں جہاں تک خالص سائنٹیفک طریقہ کا سوال ہے وہ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے حقائق کی اس نئی دُنیا کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا جس کا تعلّق مابعدالطبعیات سے ہے کیونکہ خدا کے وجود کا ادراک حواس کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس کے باوجود عقلِ سلیم کی رہنمائی کے لئے انفس و آفاق میں بے شمار شواہد موجود ہیں اور خود سائنس کی فراہم کردہ معلومات میں لاتعداد نشانیاں موجود ہیں جو ایک مدّبر اور صاحب امر ہستی کی طرف اشارہ کرتی ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والا دماغ رکھتا ہو، اس کائنات کے حقائق کو دیکھ کر بے اختیار پکار اُٹھتا ہے کہ یہ کارخانہ رنگ و بُو ایک حکیم اور دانا خالق اور فرماں روا کے بغیر نہ وجود میں آسکتا تھا اور نہ قائم رہ سکتا ہے زمین سے لے کر آسمان تک ساری کائنات ایک مکمّل نظام ہے اور یہ پورا نظام ایک زبردست قانون کے تحت چل رہا ہے، جس میں ہر طرف ایک ہمہ گیر اقتدار، ایک بے عیب حکمت، ایک بے خطا علم کے آثار نظر آتے ہیں۔ یہ آثار اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ نظام کا ایک فرماں رَوا ہے، نظم کا تصوّر ایک ناظم کے بغیر قانون کا تصوّر ایک حکمران کے بغیر، حکمت کا تصوّر ایک حکیم کے بغیر، علم کا تصوّر ایک عالم کے بغیر، اور سب سے بڑھ کر خلق کا تصوّر ایک خالق کے بغیر آخر کس طرح آسکتا ہے۔ یہ کائنات ایک منصوبہ کے تحت کام کر رہی ہے۔ کیا یہ منصوبہ ایک منصوبہ کار کے بغیر ہی

ل [illegible] کی کتاب God and EVIL صفحہ ۱۴۰

جاری وساری ہو گیا ہے؟ اس کائنات میں کمال درجہ کا حُسن و توازن ہے۔ یہ حُسن و توازن ایک منظّم کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ اس میں ایک ہمہ گیر اخلاقی قانون کارفرما ہے جو خیر کو قائم رکھتا اور شر کو ختم کرتا ہے۔ یہ اخلاقی انتخاب ایک صاحبِ ارادہ ہستی کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ یہ کائنات ایک مسلسل، مربوط اور معنی خیز کتاب کی مانند ہے، کیا اس کا کوئی مُصنّف نہیں؟ مسٹر آرتھر کیتھ نے سچ کہا ہے:—

" انسانی دماغ ان عظیم سوالات کو حل کرنے کے لئے ایک حقیر سا آلہ ہے ہمیں اس کی مجبوریوں کا اعتراف کر لینا چاہیئے لیکن پھر بھی یہ ہمہ وقت اس امر کا ادراک کر رہا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کس قدر منظّم اور مربوط ہے اور فطرت کی نت نئی ایجادات کیسی حیران کُن ہیں۔ ہر سمت میں ایک مقصد کارفرما ہے خواہ ہم عامی ہوں یا سائنسدان، ہمیں کائنات کیلئے ایک حاکمِ اعلیٰ کو ماننا پڑے گا۔ جو نام چاہے اس کو دے دو اور جو شکل چاہے اس کی تجویز کر دو مگر اس کو ماننے سے مفر نہیں۔[۱]"

اسی طرح اگر ہم اس کائنات کے آغاز پر غور کریں تو ہمیں محسوس ہو گا کہ اس کے لئے کسی خالق کی موجودگی ضروری ہے۔ علّت و معلول کا سلسلہ جہاں تک بھی چلا جائے ایک نقطۂ آغاز یقیناً ماننا پڑے گا۔ اس سلسلے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ جو خدا کو نہ ماننے والے کہتے ہیں، یعنی یہ کہ آغاز مادّے سے ہُوا، دُوسرا وہ جو خُدا کے ماننے والے کہتے ہیں یعنی یہ کہ آغاز ایک ذی شعور اور صاحبِ ارادہ ہستی سے ہُوا۔—

البتہ جو بات خدا کے وجود کے حق میں کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ شعور سے ایک محروم چیز، یعنی مادّہ ایک صاحبِ شعور کو کیسے جنم دے سکتا ہے؟ اس لئے کہ شعور مجرّد مادے سے بہت بلند ہے۔ لیکن اگر خدا کو، جو خود صاحبِ شعور ہے تسلیم کر لیا جائے تو یہ مشکل رفع

۱؎ (سر آرتھر کیتھ "I believe" صفحہ ۱۵۵) (اس باب میں انبیا کا تصوّر درست ہے)

ہو جائے، اسی طرح مادّہ کو نقطۂ آغاز مان کر کائنات کے تمام حقائق کی توجیہ نہیں کی جا سکتی لیکن ایک با اختیار و صاحب ارادہ ہستی کو خالق ماننے کے بعد کوئی اُلجھن باقی نہیں رہتی اور تمام مسائل آپ سے آپ حل ہو جاتے ہیں ـــــــ

مزید برآں اگر ہم خدا کے وجود کو تسلیم نہ کریں اور کائنات کے مبداً مادے کو قرار دیں تو انسانی اور حیوانی وجود کی تشریح بڑی مشکل نظر آتی ہے۔ سرسری طور پر بڑی آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ مختلف اجزاء ایک تناسب سے ملے اور پودے وجود میں آ گئے۔ لیکن جدید سائنسی ترقیوں کی بناء پر ایسے "اتفاقات" کو ماننا بڑا مشکل ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرینک ایلن کا کہنا ہے :ـــــــ

"پروٹین جو تمام ذی حیات خلیوں کے اجزاء لازم کی حیثیت رکھتے ہیں پانچ عناصر کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن اور گندھک پر مشتمل ہیں۔ ایک پروٹینی سالمہ ان عناصر کے چالیس ہزار جواہر کا مجموعہ ہوتا ہے، کائنات میں ۹۲ کیمیائی عناصر بالکل منتشر اور بے ترتیب بکھرے ہوئے ہیں۔ اب اس اَمر کا امکان کس حد تک ہے کہ ان ۹۲ عناصر کے بے ترتیب ڈھیر میں سے نکل کر یہ پانچوں عناصر اس طرح باہم ملیں کہ وہ ایک پروٹینی سالمہ آپ سے آپ وجود میں آ جائے؟ مادّے کی وہ مقدار جسے مسلسل ہلانے سے اتفاقاً یہ نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے اور وہ مدّت جس کے اندر اس کام کی تکمیل ممکن ہو، حساب لگا کر معلوم کی جا سکتی ہے ـــــــ"

"سوئٹزرلینڈ کے ایک حساب دان چارلس ایوجین گائی نے اس کا حساب لگایا ہے اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس طرح کے کسی اتفاقی واقعہ کا امکان 10^{160} کے مقابلہ میں صرف ایک درجہ ہو سکتا ہے۔ صرف ایک پروٹینی سالمے اتفاقاً وجود میں آنے کے لئے اس پوری کائنات کے موجود

مادّے سے کروڑوں گُنا زیادہ مادّہ مطلوب ہوگا جسے یکجا کر کے ہلایا جائے اور اس عمل سے کوئی نتیجہ برآمد ہونے کا امکان $۱۰^{۲۴۳}$ سال کے بعد پیدا ہوگا۔
"پروٹین" امینو ترشوں کے لمبے سلسلوں سے وجود میں آتے ہیں۔
اس میں سب سے زیادہ اہمیّت اس طریقے کی ہے جس سے یہ سلسلے ملیں اگر یہ غلط شکل میں یکجا ہو جائیں تو زندگی کی بقا کا ذریعہ بننے کی بجائے مہلک زہر بن جاتے ہیں۔ پروفیسر جے بی لیڈز نے حساب لگایا ہے کہ ایک مادّہ سے پروٹین کے سلسلے کو $۱۰^{۴۸}$ طریقوں سے یکجا کیا جا سکتا ہے۔ یہ کسی طرح عقل میں آنے والی بات نہیں ہے کہ پروٹینی سالمے کو وجود میں لانے کیلئے اتنے بہت سے بعید از امکان اتفاقات بیک وقت صادر ہو جائیں۔"

درحقیقت یہ اکیلی مثال نہیں، بلکہ نباتات و حیوانات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اس قسم کی بے شمار مثالوں سے واسطہ پڑتا ہے، اس سلسلے میں ہم ارتقائی حیاتیات سے متعلّق ایک مثال پر اکتفا کریں گے ——

نظریۂ ارتقاء کی رو سے حیات کی زیادہ ترقی یافتہ شکلیں درحقیقت کم ترقی یافتہ شکلوں سے ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ چارلس ڈارون کے نظریہ کے مطابق یہ ارتقا محض میکانیکی قوّتوں کی بنا پر ہوا ہے —— لیکن بعد کے ماہرین حیاتیات نے محسوس کیا کہ محض میکانیکی قوّتیں ارتقاء کی تشریح نہیں کر سکتیں۔ مثال کے طور پر آنکھ کے ارتقا کا مسئلہ لیجیئے۔ اگر آنکھ کے عدسے کی ایک سطح میں اتفاقاً کوئی معمولی سی تبدیلی بھی ہو جائے (جس کے بغیر آنکھ کا ارتقا ممکن نہیں ہے) تو اس کے ساتھ ہی ساتھ دوسری سطح میں بھی بیک وقت ایک مخصوص تبدیلی ہونی چاہیئے۔ اس دوسری سطح میں تبدیلی لکھو کھا شکلوں میں ہو سکتی ہے جس میں سے صرف ایک مخصوص تبدیلی کی ضرورت ہے ورنہ بینائی میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا، ان دونوں سطحوں میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ قرینہ کی شکل یا

عدسے کے مرکز کے فاصلے میں تبدیلی ہونی چاہیئے۔ اور یہ سب تبدیلیاں بیک وقت ہونی چاہئیں ورنہ بینائی بہتر نہ ہوگی ـــــ

حیاتیات کا مطالعہ کرنے والوں کو اس قسم کی بے شمار مثالوں سے سابقہ پڑتا ہے جہاں محسوس ہوتا ہے کہ سب کچھ اندھے اتفاقات سے نہیں بلکہ سوچے سمجھے منصوبے کے پیشِ نظر ہوا ہے ـــــ

نظریۂ ارتقاء ابتداً دو سائنس دانوں نے پیش کیا تھا۔ ایک چارلس ڈارون اور دوسرا الفرڈ رسل ولاس۔ لیکن بعد میں الفرڈ رسل نے اپنی کتاب شائع نہ کی اور نظریۂ ارتقاء کا سہرا ڈارون کے سر بندھا، لیکن ڈارون کے نظریات کے برعکس ولاس کا کہنا تھا کہ محض فطری قوّتوں کے ذریعے انسانی وجود کی تشریح نہیں کی جا سکتی۔ اس کا خیال تھا کہ " حیاتیاتی دُنیا میں کم از کم تین ایسے مقامات آتے ہیں جہاں کسی نئی قوّت یا علّت کی مداخلت لازمی ہوئی ہے۔ ایک وہ وقت جب کہ پہلے جان دار خلیئے کی تشکیل ہوئی۔ دُوسرا وہ مقام جہاں سے حیواناتی اور نباتاتی زندگی جُدا ہوئی۔ اور تیسرا وہ وقت جہاں انسان عالَم وجود میں آیا " یہ بات کہنے سے ولاس کا مقصد بھی یہی ہے کہ کم از کم تین ایسے نمایاں مقامات آتے ہیں جہاں بات کو اتّفاقات کا سہارا لے کر نہیں ٹالا جا سکتا ہے اور کسی بُلند تر قوّت کے وجود کو ماننا پڑتا ہے ـــــ

ارتقائے کائنات کے مسئلہ پر جتنا غور کیا جائے ایک خالق اور ربّ کی ضرورت کا احساس اتنا ہی شدید ہوتا جاتا ہے۔ نظریۂ ارتقاء سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات میں زندگی کے ظہور سے قبل بے شمار غیر معمولی اور ہمہ گیر تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ زمین نے ایک خاص ہیئت اختیار کی، ہوا اور پانی کی ایک مخصوص شکل قائم ہوئی ہے، موسم کا نظام اور ٹمپریچر زندگی کے قیام اور بقاء کے لئے سازگار ہوئے۔ ان گنت تبدیلیوں کے بعد یہ زمین انسان کا مستقر بننے کے لئے تیار ہوئی اور پھر زندگی کا ظہور ہوا۔ سوال یہ

ہے کہ اتنی منظّم، مرتّب اور منضبط تبدیلیاں آپ سے آپ کیسے واقع ہو سکتی ہیں؟ ہر چیز ایک دُوسرے سے پیوست ہو اور تمام تبدیلیوں کے تعاون و توافق سے زندگی کے آئندہ مراحل طے ہونے کے لائق بنیں، کیا ایک ہمہ گیر حکمت کے بغیر یہ سب متناسب تبدیلیاں واقع ہو سکتی ہیں؟ کیا عقل اسے ماننے کے لئے تیار ہے کہ یہ سب محض ایک حادثہ اور اتفاق کی بنا پر ہو گیا۔ اگر اس کا نام "حادثہ" اور "اتفاق" ہے تو پھر لُغت میں ان الفاظ کے معنی تبدیل کرنے پڑیں گے۔! ———

کیا کبھی ایسا "اتفاق" بھی واقع ہُوا ہے کہ حروف کو ایک ڈبے میں ڈال کر ہلایا گیا ہو اور جب ان کو دوبارہ زمین پر ڈالا گیا ہو تو ان سے ایک مربوط عمارت بن گئی؟ کیا کبھی ایسا "حادثہ" بھی پیش آیا ہے کہ غالبؔ یا اقبالؔ کے کسی شعر کے الفاظ کو اُلٹ پلٹ کر کسی جاہل کو دے دیئے گئے ہوں اور وہ الفاظ کو آگے پیچھے رکھ کر ترتیب دے اور غالبؔ یا اقبالؔ کا شعر نکل آئے، حالانکہ حروف، الفاظ، جُملے سب وہی ہوں؟ اگر اس طرح ایک شعر نہیں بن سکتا تو یہ پُوری کائنات اور جو کُچھ اس میں ہے کس طرح بن سکتے ہیں؟ — بے شک ———

صُنْعَ اللّٰہِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ ط

اُس اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر شے کو

مضبوط (نظام پر) بنایا ( )

وَخَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقْدِیْرًا ط

خدا نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کا اندازہ مقرر کیا۔

حیات و کائنات کی ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ

کہ سائنسی تجربات اور عقلِ سلیم دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ہم اس دُنیا کو محض اِتّفاقات کا نتیجہ قرار نہیں دے سکتے ——

اُس کی ہر شے

زبانِ حال سے پُکار رہی ہے کہ کسی صاحبِ حکمت اور ذی اختیار ہستی نے اسے وجود بخشا ہے۔ وہی اس کی خالق ہے اور وہی اس کی حاکم اور فرمانروا ہے ——

(پروفیسر خورشید احمد)

پرویز صاحب لکھتے ہیں :-

قوانینِ فطرت اور خُدا کی مجبوری

قوانینِ فطرت کسے کہتے ہیں ؟ ——

اس عنوان پر (WHITEHEAD) نے اپنی کتاب (ADVENTURES OF LDEAS) کے ساتویں باب میں بڑی دلچسپ بحث کی ہے جس کا ملخص ذیل کی سطور میں پیش کیا جاتا ہے اس مفکّر کے نزدیک آج کل قوانینِ فطرت کے متعلّق چار نظریات متداول ہیں ——

ا —— (LAW OF LMMANENCE) اس نظریہ سے مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں کوئی شے اپنی ذاتی خصوصیت کی بنا پر قائم نہیں بلکہ ہر شے اپنی ہستی کے لئے دوسری اشیاء کی محتاج ہے ۔ لہذا تمام اشیاء میں باہمی رابطہ ہے ۔ اشیاء کی ماہیت سمجھنے سے مفہوم یہ ہے کہ ہم اس بُنیادی رابطہ کو سمجھ لیں جس سے یہ اشیاء باہم دگر مربوط ہیں ۔ اسی رابطہ کو قانونِ فطرت کہتے ہیں ۔ لہذا علمائے سائنس کا کام یہ نہیں کہ وہ فطرت کے فعل کے متعلّق اپنے مشاہدات قلم بند کرتے ہیں بلکہ ان کا فریضہ ہے کہ وہ اس ربطِ دروں کو کو تلاش بھی کریں ——

۲ — (I.MPOSED LAWS) اس نظریہ کا ملخص یہ ہے کہ ہر شئے ایک منفرد خصوصیت رکھتی ہے اور اس کی ہستی اسی خصوصیّت سے قائم ہے۔ لہذا اپنی ہستی کے لئے کوئی شئے کسی دوسری شے کی محتاج نہیں۔ لیکن ان تمام اشیاء پر خارج سے ایک قانون عائد کر دیا گیا ہے کہ وہ باہم دیگر ربط و ضبط رکھیں۔ اس خارج سے عائد کردہ قانون کا نام قانونِ فطرت ہے۔ نیوٹن اور ڈیکارٹ وغیرہ کے نزدیک یہ خارجی قانون خدا کا عائد کردہ ہے یا یوں سمجھئے کہ خود خدا ہے۔ الٰہیات میں اس تصوّر کو (DEISM) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی (GOD AS A PERSON) کا تصوّر جو کائنات سے باہر بیٹھا ہوا (اپنے قوانین کی روسے کائنات مشینری چلا رہا) ہے ——

۳ — (OBSERVED ORDER OF SUCCESSION) اس نظریئے سے مقصود یہ ہے کہ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم دیکھتے جائیں کہ کائنات میں کیا کچھ ہو رہا ہے اور جس طرح کوئی واقعہ ہوتا چلا جائے، اس کے متعلّق اپنے مشاہدات قلمبند کرتے چلے جائیں۔ ان مشاہدات کی روسے جو نتائج مرتّب ہوں وہی قوانینِ فطرت ہیں (یہ میکانکی قوانین کا نظریہ ہے اور اسے سائنس کی دُنیا میں (POSITIVISM) کہا جاتا ہے ——

۴ — (CONVENTIONAL INTERPRETATION) یہ درحقیقت الگ نظریہ نہیں بلکہ حکمائے یونان اور مصر کے اتباع میں ایک قسم کا تقلیدی مسلک ہے اس لئے بحث صرف اوّل الذکر تین نظریوں تک محدود ہو جاتی ہے ——

مندرجہ بالا نظریوں میں تیسرا نظریہ، علمائے سائنس کے نزدیک، سب سے زیادہ قابلِ قبول رہا ہے اور اسی کی بناء پر سائنس کے میکانکی قوانین مرتّب ہوتے ہیں۔ پہلا نظریہ بھی ایک حد تک مشاہداتی نظریہ ہی ہے لیکن، وہ مشاہدہ کے بعد نتائج کے لئے مابعد الطبیعات (METAPHYSICS) کی دُنیا میں چلا جاتا ہے۔ نظریۂ دوم کی روسے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ فطرت کے قوانین خارج سے عائد شدہ ہیں اس لئے وہ غیر متبدل ہیں ——

لیکن سوال یہ نہیں کہ فطرت کے قوانین کی اصل کیا ہے۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ ان قوانین کے متعلق جو کچھ سائنس اس وقت دریافت کر چکی ہے وہ حتمی اور یقینی ہے یا اس میں تبدیلیاں ہوتی جا رہی ہیں؟ اگر ان میں تبدیلیاں ہوتی جا رہی ہیں تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سائنس کے مکتشفات یقین کے درجہ تک پہنچ چکے ہیں، لہٰذا انہی کی بنیادوں پر زندگی کے مسائل کو حل کرنا چاہیئے۔ اس باب میں سب سے نمایاں سوال جبریت (DETERMINISM) یا عدم جبریت (INDETERMINISM) کا ہے۔

جبریّت و عدم جبریّت

یعنی یہ سوال کہ مادّہ کے افعال متعیّن ہیں یا غیر متعیّن۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ میکانکی تصوّرِ کائنات کی رو سے، یہ تمام افعال علّت و معلول کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے فلہٰذا متعیّن ہیں، لیکن اب بیسویں صدی میں طبیعیات سے متعلّق مزید تجارب و مشاہدات نے اس تصوّر میں نمایاں تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ یہ تبدیلی علم الحیات (BIOLOGY) اور طبیعیات (PHYSICS) دونوں میں ہوئی ہے ——

ڈارون کا نظریۂ ارتقاء اور اس کا زوال،

علم الحیات میں ڈارون کا نظریہ ارتقاء ایک حقیقتِ ثابتہ کی طرح تسلیم ہوتا چلا آرہا تھا۔ اس نظریہ کی رو سے کائنات میں عملِ ارتقاء لگے بندھے میکانکی اصولوں کے مطابق جاری ہے۔ یہ اصول علّت و معلول کی کڑیوں سے اس طرح بندھے ہیں کہ ان میں کہیں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس میکانکیت کے پیشِ نظر پروفیسر ٹینڈل نے ۱۸۷۴ء میں برٹش ایسوسی ایشن کے اجلاس میں کہا تھا کہ "سائنس کی رو سے ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ ہم اوّلین ہیولیٰ کائنات کے ایٹم سے لے کر برٹش ایسوسی ایشن کے اجلاس تک کے تمام ارتقائی سلسلہ کا بیک وقت جائزہ لے سکیں۔" ڈارون کی (ORIGIN OF SPECIES)

کے بعد ہربرٹ اسپنسر نے بقاء للاصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) کے نظریہ کے ماتحت اس میکانکی تصوّرِ ارتقاء کو مزید تقویت پہنچائی لیکن ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ ۱۹۰۷ء میں) کیلاگ (VERNON KELLOGG) نے اپنی کتاب (DARWINISM TO-DAY) میں بتایا کہ خود ڈارون ازم کے ماتحت قریب ایک درجن مختلف مکاتبِ فکر اس وقت تک معرضِ وجود میں آچکے تھے جن میں خود اس نظریہ کے متعلّق اختلافات پیدا ہو چکے تھے. اس کے کچھ عرصہ بعد ویس مین (AUGUST WEISMANN) نے اپنی تحقیقات کی روشنی میں ڈارون کے بنیادی نظریہ "ماحول" کی تردید کی۔ ازاں بعد ڈرلش (HANS DRIESCE) نے اس ساری کی ساری بُنیاد کو منہدم کر دیا۔ اس اثناء میں کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر بیٹسن (BATESEN) نے مینڈل (MENDEL) کی تحقیقات کو اپنی تنقید کے ساتھ شائع کیا، جن کی رو سے ڈارون کا بُنیادی نظریہ ناقابلِ قبول قرار دیا گیا ——

المختصر اس پچاس سال میں نظریۂ ارتقاء کے بُنیادی اصولوں کے متعلّق اس قدر مختلف اور متضاد تصوّر پیش ہو چکے ہیں کہ (BATESON) کے الفاظ میں : —

" نظریۂ ارتقاء اپنے مدہم سے خاکہ کے اعتبار سے واضح
ہے اور واقعات بھی اس کی تائید کرتے ہیں. لیکن اس نظریہ
کی بُنیادی اصل جس کا تعلّق انواع کی ابتداء اور نیچر سے ہے
یکسر پردۂ باطن میں ہے ——"

یہاں تک تو پھر بھی تحقیقات کا رُخ میکانکی اصولوں کی طرف جا رہا تھا لیکن دورِ حاضر کی تحقیقات نے اس بُنیادی اصول کو بھی جڑ سے ہلا دیا۔ چنانچہ ان تحقیقات کی رُو سے یہ حقیقت سامنے آرہی ہے کہ انواع (SPECIES) میں بعض اوقات اس طرح تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں کہ "مطابق بہ ماحول" (ADAPTATION TO ENVIRONMENT)

کا اصول ان کی کوئی توجیہہ بیان نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی ہنگامی تبدیلیوں کو جدید ارتقاء کی اصلاح میں (MUTATION) کہا جاتا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے علم نباتات میں (SPORTS) کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی ایک ہی قسم کے بیجوں سے بعض اوقات مختلف قسم کے پھول پیدا ہو

نظریۂ فجائی ارتقاء

جاتے ہیں۔ اس انکشاف کا سہرا پروفیسر مارگن (LLOYD MORGAN) کے سر ہے جس کے نظریۂ فجائی ارتقاء (EMERGENT EVOLUTION) نے ارتقائی سائنس میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے بعض اوقات ایک نوع، علت و معلول کی کئی کڑیاں پھاند کر، دوسری نوع میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ارتقاء کا میکانکی قانون منہ تکتا رہ جاتا ہے۔ یہ کس طرح ہوتا ہے، اس کے متعلق پروفیسر مارگن لکھتا ہے:۔

> "اگر یہ پوچھا جائے کہ تم جس چیز کو (EMERGENT) کہتے ہو وہ بالآخر ہے کیا؟ ۔ تو اس کا مختصر جواب فقط اس قدر ہے کہ یہ ایک نئی قسم کا رابطہ ہوتا ہے۔ اور اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ روابط کس اعتبار سے نئے ہوتے ہیں تو اس کا جواب اتنا ہے کہ اُن کی خصوصیات کے متعلق اُن کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"
>
> (EMERGENT EVOLUTION)

(DUM) اور (DOBZANSKY) کی جس کتاب (HEREDITY, RACE- SOCIETY) کا ذکر پہلے آچکا ہے اس میں یہ سائنسدان اس اہم مسئلہ پر بحث کرتے ہیں کہ ایک فرد جس قدر خصوصیات کا حامل ہوتا ہے اس میں کتنا کچھ اسلاف سے وراثت میں ملتا ہے۔ اس ضمن میں ان کے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ ایک ہی ماں باپ کے بچوں میں خصوصیات کا اس قدر اختلاف کیوں ہوتا ہے؟ وہ اس کے جواب میں کہتے ہیں۔

" علمِ وراثت کا طالبِ علم آپ سے کہے گا کہ وراثت کے یہ اختلافات (MUTATIONS) کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب آپ سے یہ کرید کر پوچھیں گے کہ (MUTATION) ہوتا کیا ہے تو وہ صرف اتنا بتا سکے گا کہ یہ وراثت میں ایک ہنگامی تبدیلی کا نام ہے وہ اس پر اصرار کرتا جائے گا کہ وراثت کی ان خصوصیات میں اختلاف کا باعث (MUTATION) ہے۔ لیکن جب آپ اس سے کہیں گے کہ یہ چیز پیدا کس طرح سے ہوتی ہے۔ تو اسے اس کا اعتراف کرنے پڑے گا کہ اسے تو وہ بھی نہیں جانتا کہ اس ہنگامی تبدیلیوں کا سبب کیا ہے؟ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ایسا ہوتا ضرور ہے..... یہ تبدیلی پسِ پردۂ غیب سے رونما ہوجاتی ہے ——— " (P. 26-27)

جس طرح علم الحیات میں "اتفاقی حوادث" رونما ہوتے ہیں۔ اسی طرح علم النفس کی رو سے بھی اس قسم کے "ناگہانی حوادث" ہوتے ہیں جو ان تمام قوانین و ضوابط کے خلاف ہوتے ہیں جن کے ماتحت عام انسانی سیرت کی تعمیر ہوتی ہے۔ ہم نے (BEHAVIOURISM) کے عنوان میں دیکھا تھا کہ علم النفس جدید کی رو سے انسانی بچّہ کی سیرت و کردار مجموعہ ہوتی ہے اس کے موروثی اثرات، ابتدائی ماحول، تعلیم اور تربیّت کا۔ یا پھر اُن غدودوں کا ( ) جو اُسے طبعی طور پر متوارث ملتے ہیں۔ لیکن ایک (GENIUS) کی پیدائش ان تمام اصولوں کے خلاف عمل میں آتی ہے۔ وہ وراثت، ماحول، تعلیم، تربیّت، غرضیکہ تمام خارجی اثرات کے علی الرغم ایک مختلف سیرت کا پیکر اور جُداگانہ کردار کا حامل ہوتا ہے۔ پروفیسر (L. HOGBEN) اس باب میں رقم طراز ہے :-

"تیس سال کے گہرے تجربہ نے اس امر کا بیّن ثبوت بہم پہنچا دیا ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر مخلوط نسل کے انسانوں کے اندر اس قسم

قسم کے افراد پیدا ہو جاتے ہیں جن کے خصائص اپنے آباؤ اجداد سے بالکل مختلف ہوتے ہیں

(THE NATURE OF LIVING MATTER)

انہی انکشافات کے پیشِ نظر پروفیسر (TAYLOR) کو کہنا پڑا ہے کہ:۔

"اُن تمام اسباب وعلل کا جن سے کوئی شے وجود پذیر ہوتی ہے محاسبہ کر لینے کے بعد بھی یہ امکان باقی رہ جاتا ہے کہ یہ شے اپنے نشوونما کے بعد ایسی خصوصیت کا مظہر بن جائے جو اُن عناصر میں کہیں بھی نہ ہو جن سے اس شے نے ترکیب پائی تھی۔ یہ خصوصیت ایسی ہوتی ہے۔ کہ ان تمام عناصر کی خصوصیات کا علم حاصل ہو جانے کے بعد بھی اس نرالی خصوصیّت کے متعلّق پہلے سے کچھ نہیں کہا جا سکتا"

(EVOLUTION IN THE LIGHT OF Modern KNOWLEDGE)

نیچرل ازم

اب جدید انکشافات کی رو سے مادئیین نے اب اپنی قدیم اصطلاح مادیّت (MATERIALISM) کو چھوڑ کر ایک نئی اصطلاح، فطریت (NATURALISM) وضع کی ہے۔ اس نظریہ کی رو سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ (۱) تمام کائناتی افعال کا سرچشمہ نیچر ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔ (۲) نیچر صرف ایٹم (ATOMS) کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک تخلیقی عمل ہے۔ اور (۳) اس تخلیقی عمل میں ایسی ایسی نئی خصوصیات کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ جن کے مشہود ہونے سے پہلے ان کے متعلّق کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کیا ہوں گی۔ ان نئی خصوصیات کو (EM-ERGENTS) کہتے ہیں۔ اس بناء پر سب سے پہلے (EMERGENT) خود "زندگی" ہے۔ اور اس کے بعد دوسرا (EMERGENT) نفس یا شعور، اس گروہ میں سب سے پہلے زیادہ نمایاں ہستی پروفیسر الیگزنڈر (SAMUEL ALEXANDER ۱۸۵۹ - ۱۹۳۸) کی ہے جس نے اپنے مجموعۂ خطبات (SPACE TIME AND DEITY) میں بتایا ہے کہ جب کوئی شے

اپنے ارتقاء کی آخری منزل تک پہنچ جاتی ہے تو اس کے بعد اس سطح کے ارتقاء سے ایک نئی فجائی سطح (EMERGENT LEVEL) اُبھرتی ہے۔ اس حقیقت کا نام الیگزنڈر کی اصطلاح میں (DEity) ہے وہ اسے خدا سے الگ قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک "خدا اس کائنات کا نام ہے جس میں (DEity) عمل پیرا ہے"———

اصولِ تعدیل اور خُدا کی مجبوری

اَب آیئے خود طبیعیات کی طرف۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کلاسیکل فزکس میں نظریۂ علّت و معلول (CAUSALity) کو ایسا غیر متبدل سمجھا جاتا تھا کہ علمائے طبیعیات کے نزدیک "خدا بھی چاہے تو سلسلۂ علّت و معلول میں تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا"۔ لیکن اب نظریۂ کوانٹم (QUANTUM THEORY) کی رو سے ثابت کیا جا رہا ہے کہ کائنات میں غیر متبدل اور جامد قانون علّت و معلول کی جگہ "غیر تعین" (LNDETERMI-NACY) کا قانون نافذ العمل ہے۔ آئزن برگ (WERN-AR HEiSENBERG) کے "اصول غیر تعین" کی رو سے ایک برقیہ (ELECtRON) مقام (POSitiON) بھی رکھتا ہے اور رفتار (VELOCitY) بھی۔ لیکن ان دونوں کا بیک وقت علم نہیں ہو سکتا۔ ایک برقیہ کا مقام جس قدر یقین کے ساتھ کر لیا جائے اسی قدر اس کی رفتار غیر متعین ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جس قدر یقین کے ساتھ اس کی رفتار متعین کر لی جائے اس کی پوزیشن غیر متعیّن ہو جاتی ہے۔ لہذا سائنس کے لئے یہ بتانا ناممکن ہے کہ ایک برقیہ "چھلانگ کر" کدھر جائے گا۔ اسی بناء پر علمائے طبیعیات

قانونِ علّت و معلول غیر متعیّن ہے

اب اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ "فکرِ انسانی میں قانونِ علّت و معلول

ایک لازمی عنصر نہیں رہا"۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے میکس پلانک کی کتاب (WORLD OF NATURE CAUSALITY IN THE) ۔ خود آئزن برگ لکھتا ہے کہ" مقادیر کی میکانکس کی رو سے یہ متعین ہو چکا ہے کہ علّت و معلول کا قانون باطل ہے"۔ اس نئے نظریہ نے فلسفہ اور اخلاقیات کو بڑی حد تک متاثر کیا ہے، اس لئے کہ پرانے نظریہ علّت و معلول کی رو سے انسان مجبور محض تسلیم کیا جاتا تھا، لیکن اب اس نظریہ کی رو سے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ تسلیم کرنے کے لئے طبعی دلیل بہم پہنچ گئی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر جیمز مرفی، میکس پلانک کی کتاب (WHERE IS SCIENCE GOING) کے دیباچہ میں لکھتا ہے :۔۔۔۔۔

"نظریۂ کوانٹم، جو اثرات فلسفہ پر مرتّب کر سکتا ہے اس کے متعلّق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ بعض علمائے طبیعیات نے اس امر کا حتمی اعلان کر دیا ہے کہ اس نظریہ نے سائنس کی تحقیقات کی دنیا میں پرانے اصول علّت و معلول کو یکسر خارج کر دیا ہے ۔۔۔۔"

ہر برٹ سیموئل اس باب میں لکھتا ہے :۔۔۔۔۔

" اب طبیعیات علّت و معلول کے متعیّن قانون کی پابند نہیں رہی۔ "قانونِ تعین" اب رخصت ہو گیا اور اس میں شُبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ اب واپس نہیں آسکتا، اس لئے انسانی اختیار و ارادہ کے متعلق سائنس کو جو اعتراض تھا۔ اُسے اب سائنس واپس لیتی ہے ۔۔۔۔"

(CONTEMPORARY) ۔۔۔۔۔

سر جیمز جینس اپنی کتاب (Mysterious Universe) میں لکھتا ہے۔

ہمارے" اختیار و ارادہ" کے عقیدہ کے خلاف اب سائنس کے پاس کوئی ناقابلِ تردید دلیل نہیں رہی ۔۔۔۔"

ایڈنگٹن کہتا ہے :۔

"اب جو شخص جبر کا عقیدہ رکھتا ہے اُسے سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ عقیدہ اُس کے اپنے خیالات کی پیداوار ہے۔ اُسے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ ایک ایسا عقیدہ رکھ رہا ہے جس کی تائید سائنس کے تجرباتی دلائل سے ہو سکتی ہے۔" (NATURE OF THE PHYSICAL WORLD - BY EDDINGTON)

یہ ہیں سائنس کے وہ جدید انکشافات جن کے پیشِ نظر (MAX PLANCK) قوانینِ فطرت کے متعلق اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ :۔

"ہمیں اب فرض کر لینے کا کوئی حق نہیں کہ کوئی خاص قوانین فطرت موجود ہیں یا یہ کہ اگر کوئی خاص قوانین اس وقت تک موجود ہیں تو آئندہ بھی ایسے ہی رہیں گے۔ یہ بات بالکل قابلِ فہم ہے کہ کسی سہانی صبح فطرت کسی ایسے خلافِ توقع واقعہ کو ظہور میں لے آئے جس سے ہم سب ہکے بکے رہ جائیں۔ اس صورت میں ہم بے بس ہوں گے کہ اس کے خلاف لب کشائی کر سکیں۔ خواہ اس کا نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو.... ایسے حالات میں سائنس کے لئے اس کے سوا چارہ کار نہ ہوگا کہ وہ اپنی تہی دامنی کا اعلان کر دے۔"

(UNIVERSE IN THE LIGHT)

اس مقام تک ہم نے دیکھ لیا کہ سائنس کی جدید تحقیقات کی رو سے علّت و معلول کی وہ تمام عمارت جس کی بنیادوں پر میکانکی تصوّرِ حیات قائم تھا، کس طرح منہدم ہو چکی ہے اور اس کی جگہ اب "عدمِ تعین کا قانون" (LAW OF INDETERMINACY) لے چکا ہے ۔۔۔

ہم صرف ان چند مثالوں تک اکتفا کرتے ہیں۔ اس سے مقصود یہ بتانا تھا کہ تحقیقات

جدیدہ کی رو سے سائنس کی جزئیات ہی نہیں بلکہ اس کے بنیادی اصول تک بدلتے جا رہے ہیں۔ بقول (WHITEHEAD) ——

" سائنس کے فکر کی قدیم بنیادیں اب ناقابلِ فہم ہوتی جا رہی ہیں۔ زمان، مکان، مادّہ، ایتھر، برق، میکانکیت نامیاتی نظام، ترتیبِ اجزا، ساخت، قالب، افعال، سب پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔"

(SCIENCE AND THE MODERN WORLD)

اسی بنا پر پروفیسر مذکور آگے چل کر لکھتا ہے کہ :—

" سائنس تو الٰہیات سے بھی زیادہ قابلِ تغیّر و تبدل ہے۔ آج سائنس کا کوئی عالم گلیلیو کے عقائد یا نیوٹن کے معتقدات کو بلا مشروط تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ حتیٰ کہ وہ خود اپنے دس سال پہلے کے معتقدات کو بھی علیٰ حالہٖ صحیح تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ (PAGE) 212)

آئن سٹائن کے الفاظ میں :—

" سائنس کا قانون حرفِ آخر قرار نہیں پا سکتا، اس لئے کہ جوں جوں سائنس ترقی کرتی جاتی ہے۔ وہ تصوّرات جن کی بنیادوں پر وہ قوانین مبنی ہوتے ہیں، نامکمل ہوتے ہیں اور ناکافی ثابت ہوتے چلے جاتے ہیں۔"

(QUOTED BY MOSZKOWSKI)

یہی وجہ ہے کہ (ماخ MACH) کے الفاظ میں " اب علمائے سائنس اپنے نظریات کو اس حتم و یقین کے ساتھ پیش نہیں کرتے جس طرح شروع شروع میں میکانکی تصوّرِ حیات کے حاملین پیش کیا کرتے تھے ——"

(THE REACTION AGAINST IDEALISM)

اسی بنا پر (KENNETH WALKER) نے کہا ہے کہ :

"سائنس کے نظریات، فکرِ انسانی کے لئے سستانے کے مقامات ہیں۔ جب کسی نئی حقیقت کے انکشاف سے معلوم ہو کہ فلاں نظریہ اس سے مطابقت نہیں رکھتا، اسے فوراً چھوڑ دینا چاہیئے"۔

(MEANING AND PURPOSE) —

اور آج کے نظریوں کے متعلّق بریفائٹ (BRIFFAULT) کی تنقید قابلِ غور ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"ہمارے طبیعیاتی وحیاتیاتی نظریئے آنے والی نسلوں کو اسی طرح عجوبہ دکھائی دیں گے جس طرح ہمیں آج اُس زمانہ کے نظریئے مضحکہ انگیز دکھائی دیتے ہیں جب سائنس اپنے عہدِ طفولیت میں تھی —

(THE MAKING OF HUMANITY)

اس باب میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ سائنس کی دُنیا میں اُنیسویں صدی تک جو بُنیادی اصول بطور مسلّمات تسلیم ہوتے چلے آ رہے ہیں بعد کے انکشافات نے انہیں کس طرح بدل دیا اور اُن کی جگہ ایسے اصولوں نے لی جن سے انسانی فکر کائنات اور خود انسان کے متعلّق ایک جُداگانہ زاویہ سے سوچنے لگا۔ اس وقت تک کی بحث کے نتائج یہ ہیں:۔

حاصلِ مبحث

(۱) میکانکی تصوّرِ حیات کی رو سے مادّہ کو مادی شکل کا مستقل جوہر سمجھا جاتا تھا لیکن تحقیقات جدیدہ کی رو سے مادّہ، روشنی کی لہریں، مربوط حوادث یا منجمد خیالات تصوّر کیا جانے لگا۔ اور اصطلاحی فرق کو چھوڑ کر اب اس حقیقت کے اعتراف پر سب متفق ہیں کہ مادّہ کی ابتدا مادّی کائنات سے نہیں ہوئی۔ اس کی اصل "رُوحانی" دُنیا سے متعلّق ہے —

جو مادّہ کے بجائے مطلق توانائی :: حرکتِ محض یا رُوحِ خالص سے معمور

ہے۔ اس دُنیا کا نام "غیب کی دُنیا" یا غیر مرئی عالم قرار دیا جا رہا ہے۔

۲ — اس غیب کی دُنیا کا علم ہمارے حواس کے ذریعے ممکن نہیں —

۳ — زندگی، مادّہ کی پیداوار نہیں بلکہ اس کا تعلّق بھی اس غیب کی دُنیا سے ہے

۴ — شعور، زندگی کے ارتقاء سے وجود میں نہیں آیا، بلکہ اس کا تعلّق بھی اسی غیر مرئی عالم سے ہے —

۵ — میکانکی تصوّرِ حیات کی رو سے یہ مانا جاتا تھا کہ فطرت کے قوانینِ علّت و معلول کی جامد کڑیوں میں جکڑے ہُوئے ہیں۔ یہ قوانین" اندھی فطرت کی اندھی قوّت" کے ماتحت ایک مشین کی طرح کام کئے جا رہے ہیں۔ ان میں نہ تغیّر و تبدل ہو سکتا ہے نہ حک و اضافہ۔ لیکن اب تحقیقاتِ جدیدہ کی رو سے فکرِ انسانی یہ تسلیم کر رہا ہے کہ خود طبیعیات کی دُنیا میں بھی قوانینِ فطرت متعیّن نہیں ہیں بلکہ حوادث اسی طرح رونما ہوتے ہیں کہ ان کے ظہور میں آنے سے پہلے ان کے متعلّق کبھی حتم و یقین سے کچھ کہا ہی جا سکتا —

۶ — سائنس کی رُو سے پیدا شُدہ تصوّرات کوئی مستقل حیثیّت اختیار نہیں کر سکے، بلکہ ان میں آئے دن تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ نہ ہی اب علمائے سائنس کا یہ دعویٰ ہے کہ ان کے تصوّرات مطلق اور قولِ فیصل کی حیثیّت اختیار کر سکتے ہیں —

بنا بریں، سائنس اب معترف ہے کہ وہ کائنات کی حقیقت کا علم بہم نہیں پہنچا سکتی۔ جب اس کے تجارب کے نتائج آخری اور یقینی صورت اختیار کر لیں گے اس وقت بھی وہ زیادہ سے زیادہ حقیقت کے ایک پہلو کے متعلّق جزئی طور پر علم بہم پہنچا سکے گی، حقیقت کا کلی ادراک اس کے بس کی بات نہیں [لے] —— (انسان نے کیا سوچا؟ از پرویز، صفحہ ۹۷ تا ۱۰۸)

[لے] پرویز صاحب کا بنیادی عقیدہ ہے کہ اللہ نے اپنے اُوپر پابندی عائد کر دی ہے کہ ان قوانینِ فطریہ کو تبدیل نہ کرے گا۔ اس مقالے میں دیکھئے کہ وہ کس طرح اپنے نظریئے کی تردید کر رہے ہیں۔
(اسدی)

پرویزی مسلک میں

خدا کا تصوّر !

پرویز صاحب "کتاب التقدیر" میں خدا کا تصوّر اس طرح بیان کرتا ہے۔ اس کا ملخّص مفہوم یہ ہے:

کائنات کی تخلیق سے پہلے اللہ تعالیٰ اپنی مشیئت اور ارادے میں مکمّل طور پر آزاد تھا، اس نے اس وقت جس طرح چاہا کائنات کی ہر چیز کو اپنی اپنی فطرت کے مطابق پیدا کر دیا، یہ اس کا تخلیقی ورک ہے۔ سر سیّد کی اصطلاح میں اسے ورک آف گاڈ WORK OF GOD کہتے ہیں۔ پرویز لکھتے ہیں۔ پیدا ہونے کے بعد کائنات کی ہر چیز اسی طرح عمل کر رہی ہے جس طرح فطری قانون کے تحت اسے مقیّد کیا گیا تھا، مثلاً آگ کی فطرت جلانا ہے وہ تا ابد جلانے کا کام کرتی رہے گی۔ پانی کی فطرت برودت ہے وہ اپنی برودی فطرت کا پابند رہے گا، تخلیق کے بعد اب اگر اللہ چاہے کہ اپنے حکم سے آگ کی فطرت کو برودت میں اور پانی کی فطرت کو حرارت میں تبدیل کر دے تو وہ ان

کی اس مودعہ فطرت کو اس لئے تبدیل نہیں کر سکتا کہ اس کا یہ حکم اس کے اپنے سابقہ فعل کے خلاف ہو جائے گا، حالانکہ قرآن پاک میں انبیاء کرام کے جتنے معجزات بیان کئے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ معجزہ کا صدور خرقِ عادت کے بغیر ظاہر نہیں ہو سکتا یعنی جب تک کسی فطری قانون کو تبدیل نہ کیا جائے معجزہ ظاہر نہیں ہو سکتا ——

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جلانے کے لئے جس آگ کا اہتمام کیا گیا تھا جس وقت آپ کو اس آگ میں ڈالا گیا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَّسَلَامًا	ہم نے اس آگ کو حکم دیا کہ خبردار اسے جلانا نہیں بلکہ ان پر ٹھنڈی اور راحت کا باعث بن جا۔

دیکھئے! جس خالقِ فطرت میں آگ کی فطرت میں حرارت ودیعت کر رکھی تھی قرآنِ کریم ثابت کر رہا ہے کہ وہ خالقِ فطرت اس آگ کی مودعہ فطرت کو اپنے حکم (قُلْنَا) سے تبدیل بھی کر رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ تخلیق کائنات سے قبل جس طرح اپنی مشیّت اور ارادے میں آزاد تھا تخلیق کے بعد اب بھی اسی طرح صاحبِ اختیار ہے۔ اگر اس طرح اسے اس دُنیا میں بے اختیار ثابت کیا جائے تو پھر خدا کو ایسی صفات کا حامل ماننا پڑے گا جن میں کسی وقت تغیّر بھی آسکتا ہے۔ تغیّر قبول کرنا حادث کی صفت ہے اور خدا پر یہ بات محال ہے۔ خدا کو اگر قوانینِ فطریہ کے تبدیل کرنے میں مجبور مانا جائے۔ ظاہر ہے مجبوری وہاں ہوتی ہے جہاں اس کے مقابلے میں کوئی چیز زیادہ قوّت رکھتی ہو، دیکھئے خدا کے اس تصوّر میں کتنا نقص ہے جو خدا اپنی قدرت سے تخلیق تو کر سکتا ہے، لیکن تخلیق کے بعد اپنی پیدا کردہ چیزوں میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا، حالانکہ کسی چیز کی تخلیق اور اس کی فطری تبدیلی میں کافی تفاوت پایا جاتا ہے، کیونکہ کسی چیز کے پیدا کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز پہلے معدوم تھی اللہ نے اپنی مشیت سے پیدا کر کے اُسے ظاہر کر دیا اور فطری تبدیلی کا یہ مطلب ہے کہ

کسی موجود چیز میں اس کی کسی طبعی صفت میں تغیّر پیدا کر دیا جائے، آپ انصاف کریں کہ کسی چیز کو معدوم سے موجود کرنا یہ زیادہ اشد ہے یا ایک چیز جو سامنے موجود ہے اس کو ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل کرنا یہ زیادہ مشکل ہے؟ ——

قیامت کے منکرین کو یہ شبہ تھا کہ انسان جب موت کے بعد گل سڑ جاتا ہے تو قیامت میں یہ وجود دوبارہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے ——

اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتے ہیں: ——

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰهَا	بھلا تمہارا دوسری مرتبہ پیدا کرنا فی نفسہٖ زیادہ سخت ہے یا تخلیق کے لحاظ سے اس آسمان کا پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے ——

دیکھئے قیامت میں انسان کو دوبارہ پیدا کرنے میں جو ظاہری اشکال نظر آتا تھا اس اشکال کو تخلیق کے تفاوت کے ساتھ دُور کر دیا کہ آسمان جو ایک وسیع جسامت کا حامل ہے۔ اس کا پیدا کرنا زیادہ سخت ہے یا انسان جو ایک معمولی ڈھانچے کا مالک ہے اس کو دوبارہ پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے؟

اس سے معلوم ہوا، کہ اللہ تعالیٰ جب اشد امور میں پوری قدرت رکھتا ہے تو اسہل امور میں وہ کس طرح مجبور ہو سکتا ہے —؟

جس نظریئے میں خدا کو مجبور، بے بس اور اس کے مقابلے میں نیچر (Nature) کو زیادہ قوی مانا جا رہا ہو تو پھر حقیقی خدا کا اطلاق بھی اس وجود پر زیادہ صحیح ہوگا، جو ان

دونوں میں زیادہ پاور کا حامل ہوگا ——

پرویز صاحب کے اس نظریئے میں الحاد کی جس انداز کے ساتھ ترجمانی کی گئی ہے ہمارے نزدیک دوسرے کسی باطل نظریئے میں بھی ایسی تحریف موجود نہیں ہے۔

قرآن کا معجزہ ہے کہ :-

جب کوئی باطل نظریہ اس کے مقابلے میں متصادم ہوتا ہے تو وہ اپنے دلائل کے ساتھ اس کا ریزہ ریزہ کر دیتا ہے —— ہم پرویز صاحب کا ایک علمی اقتباس درج کر رہے ہیں۔ دیکھئے کہ پرویز صاحب خود اپنے ہاتھوں سے اس نیچرل ازم (Naturalism) کی تردید کر رہے ہیں جس کے تحت خدا، قوانینِ فطریہ کے سامنے مجبور اور بے بس ہو جاتا ہے ——

قوانینِ فطرت اور معجزات

از: ڈاکٹر عبدالخالق (صدر شعبہ، جامعہ پنجاب)

حسّی معجزات بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کی فعلیت کے مصدقہ مظہر ہیں جن کی تکذیب خود اللہ تعالیٰ کو جھٹلا دینے کے مترادف ہے، تاہم ثانوی طور پر ان کا ایک زمانی و مکانی پہلو بھی ہے جس کے لحاظ سے یہ ان واقعات پر مشتمل ہیں جو قوانینِ فطرت میں دخل انداز ہو کر ان کے عمل کو عارضی طور پر روک دیتے ہیں۔ زیرِ نظر بحث کا تعلّق معجزات کے اسی مؤالذکر پہلو سے ہے ——

اسلامی فکر کی تاریخ میں ہمیں حسّی معجزات کے بارے میں دو متناقض قسم کے نظریات ملتے ہیں۔ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس کائنات میں جتنے بھی واقعات رونما ہوتے ہیں وہ سب کے سب بلا واسطہ اور براہ راست اللہ کی مشیّت اور اس کے ارادہ سے ہوتے ہیں کوئی ایسے اصول و قوانین موجود نہیں جو فطرت میں از خود کارفرما ہوں اور جن کی معروضی نوعیّت کو سائنسی تجربات اور تحقیق سے دریافت کیا جا سکے، مثال کے طور پر اگر آگ میرے ہاتھ کے جل جانے کے درمیان اور پانی پینے اور پیاس کے بجھ جانے کے درمیان کوئی ایسا باہمی تعلّق نہیں ہے جسے ہم علّت و معلول کا رشتہ کہہ سکیں —— دراصل خدا خود اپنے ذاتی ارادے سے میرے ہاتھ میں جلنے کی کیفیّت یا میرے معدہ میں پیاس کے بجھ جانے کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح کائنات کا ہر سانحہ چاہے وہ کسی سطح پر رونما

ہو رہا ہو خود خدا ہی کے ارادے کا مرہونِ منّت ہے۔ گویا تمام معجزات معمول کے عین مطابق اور سراسر فطری ہیں اور تمام فطرت کلیتہً معجزات پر مشتمل ہے۔ یہ بالخصوص فرقہ اشاعرہ کا نظریہ تھا جنہوں نے قرآنی آیات اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیٍٔ قَدِیْر کی خالص لفظی تعبیر کو قبول کر لیا تھا، ان کا عمومی موقف یہ تھا کہ اگر ہم کائنات میں موجود ارادی یا غیر ارادی فعلیتوں کو تسلیم کر لیں تو اس سے خدا کے قادرِ مطلق ہونے پر حرف آئے گا اور اس کی طاقت محدود ہو جائے گی، محققین کے نزدیک یہ نظریہ حماقت سے خالی نہیں —

— اس فلسفہ علّت و معلول کے بالکل برعکس نظریہ یہ ہے کہ قوانینِ فطرت میں ریاضیاتی اور منطقی لزوم کی سی حیثیت موجود ہے۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا، اس سے بظاہر مترشح ہوتا ہے کہ اُس کا کوئی فعل قوانینِ فطرت کی خلاف نہیں کر سکتا کیونکہ یہ قوانین اُس کے عملی عہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ معتزلہ نے اسی نظریئے کو اختیار کیا تھا۔ جدید مسلم فکر میں سر سیّد احمد خان کو اس نقطۂ نظر کا پیش رو خیال کیا جاتا ہے اور پرویز بھی اسی نظریئے کا شارح ہے[1] ——

— ان کی رائے یہ ہے کہ خُدا جو قوانین بھی چاہے بنا سکتا ہے لیکن ایک دفعہ جب وہ انہیں بنا دیتا ہے تو پھر وہ مستقل طور پر نافذ العمل ہو جاتے ہیں۔ سر سیّد کی یہ رائے دراصل انیسویں صدی کے پسِ منظر کو ذہن میں رکھ کر دیکھی جانی چاہیئے — وہ دَور عمومی طور پر مادیّت کے عروج اور فطری قوانین کی جبریت پر ایمان و اعتقاد کا دَور تھا۔ اس نظریئے کا اہم نقص یہ ہے کہ اس میں خُدا محض مجبور ثابت ہوتا ہے ——

اِن دو نقطہ ہائے نظر کے درمیان کا نظریہ یہ ہے کہ عام حالات میں تو قوانین

---

۱ — پرویز نے اپنی کتابوں میں اس نظریئے کو کافی پھیلا رکھا ہے وہ کہتا ہے کہ خدا ان قوانینِ فطریہ کو تبدیل کرنے پر قادر نہیں ہے —— اس کا یہ نظریہ اس کے الحاد کی پوری ترجمانی کرتا ہے — (اسدی) ——

فطرت مؤثر رہتے ہیں لیکن جب خدا چاہے ان میں دخل انداز ہو کر کوئی غیر معمولی بات ظہور پذیر کر سکتا ہے۔ جسے مذہب کی زبان میں معجزہ کہتے ہیں اور جو متعلقہ شخص کی عظمت کی دلیل سمجھا جاتا ہے ــــ سطورِ ذیل میں اس مؤقف کی فلسفیانہ توجیہ کچھ اس انداز سے کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بھرپور عمل دخل بھی ثابت ہو جاتا ہے اور قوانینِ فطرت کی ساکھ بھی قرار رہتی ہے ــــ

یکسانی اور تعلیل کے قوانین بلاشبہ پوری کائنات میں جاری و ساری ہیں لیکن یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہ قوانین وجود کے مختلف مدارج میں مختلف انداز سے کارفرما ہیں جب ایک فطرتی سائنسدان (Natural Scientists) قوانین اور ان کی حکمرانی کی بات کرتا ہے تو اس کے تصوّر میں بالعموم صرف مادّی قوانین ہوتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ مادّہ درجاتِ وجود میں سے صرف ایک درجہ ہے۔ اس کے علاوہ حیات اور شعور کے درجات بھی ہیں۔ یہ تینوں یعنی مادّہ، حیات اور شعور اپنی اپنی تعلیل میں منفرد ہیں۔ حیات، مادّے سے اعلیٰ اور شعور خود زندگی سے برتر ہے۔ جب یہ مختلف طبقات ایک دوسرے سے رابطہ قائم کریں گے تو ہر اعلیٰ علیّت، ادنیٰ علیت پر اثر انداز ہو گی اور اس میں تغیّر پیدا کرے گی ــــ

وہ شخص جو محض مادّی سطح پر سوچنے کا عادی ہے اُسے اس نوعیّت کے مظاہر پر یقیناً احساس ہو گا کہ قوانینِ فطرت کے خلاف بات ہو گئی ہے۔ وہ اس اختلاف کی تصویب (Justification) کے لئے مادّی کائنات ہی کی طرف رجوع کرے گا لیکن اس کی یہ کوشش کبھی مکمّل طور پر کامیاب نہیں ہو گی۔ کیونکہ وہ اپنی تحقیق میں کائنات کے اعلیٰ مدارج کو نظر انداز کر رہا ہو گا ــــ

ایک عام آدمی کو ان تین طبقات کے علاوہ کسی شے کا تجربہ اور مشاہدہ نہیں ہے لیکن تمام بڑے بڑے مذاہب ان سے ماوریٰ رُوح اور اس کے درجات کا بھی

ذکر کرتے ہیں، کوئی غیر معمولی واقعہ جو روحانی قوّت کے ذریعے کسی پیغمبر یا ولی سے سرزد ہوتا ہے وہ کوئی فوق الفطرت چیز نہیں ہوتی، بشرطیکہ ہم لفظ فطرت کو وسیع ترین مفہوم میں ساری کائنات پر محیط سمجھیں۔ ہوتا صرف یہ ہے کہ ایک برتر سطح کی علیت ادنیٰ سطح کے وجود میں تعلیلی نتائج کو بدل دیتی ہے۔ اب اگر ہمارا خدا ایک شخصی خدا ہے جیسا کہ یقیناً ہے اور قرآن کا بھی واضح طور پر یہی مؤقف ہے تو پھر الوہیّت کی سطح پر بھی ایک خاص نوعیّت کی علیّت موجود ہونی چاہیئے جو اپنے تمام ماتحت طبقات پر اثر انداز ہو کر ان میں تبدیلی پیدا کر سکے، جس طرح حیات، مادّہ کے افعال بدل سکتی ہے اور شعور، حیات کے اعمال میں تبدیلی پیدا کر سکتا ہے، اسی طرح ایک شخصی خدا میں بھی یہ قدرت اور قوّت ہونی چاہیئے کہ ہر شئے کو اپنے وسیع تر مقاصد کے مطابق کر سکے۔ یہی معجزہ ہے، اس سے مُراد۔ جیسا کہ ابھی کہا جا چکا ہے۔ قوانین فطرت کی خلاف ورزی نہیں ہے ان قوانین کو، جنہیں خدا کی عادات یا اُس کی سُنّت کہہ سکتے ہیں ہرگز توڑا نہیں جا سکتا۔ تاہم ایک نہایت محدود مفہوم میں ایک برتر 'قانون' اپنے سے ادنیٰ قانون کی کارفرمائی میں دخل انداز ضرور ہو سکتا ہے، جس کے نتیجے میں کسی خاص مرتبہ وجود کے اندر ایسے افعال رونما ہوتے ہیں جن کی توجیہ اُسی مرتبے کے لیے مخصوص علل و معلولات کی روشنی میں نہیں کی جا سکتی ——

قرآن حکیم میں "ایمان بالغیب" کی جو ترکیب استعمال ہوئی ہے اُسے معجزات کی بحث سے متعلّق قرار دیا جا سکتا ہے۔ سورۂ بقرہ کی ابتدا میں ان افراد کی خصوصیات گنوائی گئی ہیں جو کتاب اللہ سے ہدایت حاصل کرنے کے اہل ہو سکتے ہیں۔ ان خصوصیات میں ایمان بالغیب کی حیثیت بُنیادی معلوم ہوتی ہے۔ بظاہر یہ اصطلاح ایک بغیر سوچے سمجھے اور اندھے اعتقاد (Blind Faith) پر دلالت کرتی ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے، قرآن کتاب مبین ہے۔ اس سے استفادہ کرنے کیلئے

جو طریق کار بھی تجویز کیا جائے اس میں (Mystification) کا عنصر بہر حال موجود نہیں ہونا چاہیئے ۔ ایمان در اصل علم و معرفت ہی کی ایک صورت ہے ۔ یہ اس یقین محکم سے عبارت ہے جس کے مطابق مرئی حقائق سے ماوری مؤثر صداقتیں موجود ہیں اور محسوس اشیاء ہی کُل کائنات نہیں ہیں قرآن نے یقیناً مادّی کائنات کی اہمیت اور اس کے بارے میں غور و فکر کرنے پر بہت زور دیا ہے لیکن مختلف مظاہر کو محض آیاتِ الٰہیّہ کا درجہ دیا گیا ہے ۔ اس لحاظ سے فطرت کی اہمیّت اس لئے نہیں ہے کہ وہ واقعتاً موجود ہے بلکہ اس لئے ہے کہ اس کے اندر کچھ مابعد الطبعی اور تصوّراتی جہتیں پائی جاتی ہیں ۔ وہ لوگ جو ان جہتوں سے نا آشنا ہیں کائنات کو عملی اعتبار خود مکتفی سمجھتے ہیں ان کے نزدیک خدا ایک مؤثر اور فعال ہستی نہیں ہے جو ہماری دعاؤں کو قبول کرتی ہے جس سے معجزات کا صدور ہوتا ہے جو انسان کے ساتھ ایک شخصی رشتہ استوار کر کے مختلف مقاصد کی تکمیل کے لئے اس کے ساتھ شریک کار ہوتی ہے ۔ اس کے برعکس اگر ان جہتوں کو ملحوظ رکھا جائے تو ہم اس زمان و مکان کی کائنات پر جس قدر زیادہ غور کریں گے معجزات پر ہمارا یقین و ایمان اسی قدر راسخ ہوتا جائے گا ———

(ماخوذ)

سائنس کے جدید تصوّرات میں

دہریّت کا خاتمہ

ڈاکٹر رضی الدّین صدّیقی لکھتے ہیں۔!

جب نیوٹن نے سترھویں صدی کے اواخر میں قانون تجاذب کا انکشاف کیا اور علمِ حرکت کی تدوین کی تو ان قوانین کا اطلاق نہ صرف روئے زمین پر پیش آنے والے واقعات پر کیا گیا بلکہ نظامِ شمسی کے سیّاروں اور دوسرے مظاہر پر بھی اس کو وسعت دی گئی اور مشہور فرانسیسی ریاضی دان لاپلاس نے تو یہاں کہہ دیا کہ اس کائنات کی میکانکس ایک ہی ہو سکتی ہے اور اس میکانکس کو نیوٹن نے دریافت کرلیا ہے۔ اس کا مطلب یہ لیا گیا کہ اب اس سے آگے کسی اور کے لئے کچھ کرنا باقی نہیں ہے ——

اُنیسویں صدی میں اس میکانکس کی جڑیں اس قدر مضبوط اور وسیع ہوگئیں۔ کہ نہ صرف طبیعی علوم میں بلکہ حیاتیاتی علوم میں بھی اُن کا اطلاق کرنے کی کوشش کی جانے لگی علومِ فلکیات، طبیعیات، کیمیا، اور حیاتیات میں اس غیر معمولی ترقی کی وجہ سے مادیّت اور دہریّت کو زبردست تقویّت پہنچی اور ظاہر میں لوگوں نے یہ سمجھنا شروع کیا کہ سائنس نے مذہب کی بُنیادیں کھوکھلی کردی ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں شروع سے آخر تک علّت و معلول کا ایک سلسلہ کارفرما ہے جس کی بنا پر اس کی تخلیق بھی ہوئی اور تکمیل بھی ہو رہی ہے۔ نہ کسی خالق کی ضرورت ہے

نہ قیوم کی ــــــ

علمی دُنیا کا یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ جب نیوٹن کے نظریوں پر مبنی طبعیات اُنیسویں صدی کے آخری حصّے میں اپنے عروج پر پہنچ رہی تھی، عین اُسی زمانے میں پے درپے چند ایسے تجربے اور مشاہدے ہوئے کہ خود اس علم کی بُنیادیں ہل گئیں اور علمِ طبعیات میں ایک ہمہ گیر انقلاب رونما ہُوا۔ مادّہ اور توانائی، ذرّہ اور موج، جوہر اور عنصر، زمان ومکان اور علّت اور معلول جیسے بُنیادی تصوّر ہی سرے سے بدل گئے اور خود قوانینِ قدرت کا بھی ایک نیا مفہوم لیا جانے لگا۔ ان تصوّرات نے نیوٹن اور میکسول کی طبعیات کی بجائے اس جدید طبعیات کی تشکیل کی جس کی بُنیاد کوانٹم اور اضافیت کے نظریوں پر رکھی گئی ہے۔ ان نئے تصوّرات کی کماحقہٗ تشریح کے لئے تو ایک پوری کتاب درکار ہوگی لیکن ان کو کسی حد تک بتائے بغیر آگے بڑھنا بھی مشکل ہے کیونکہ اس مضمون کا دارو مدار بھی ان تغیّرات پر ہے جو جدید سائنس میں رونما ہوئے ہیں ــــــ اُنیسویں صدی کی طبعیات میں مادّہ اور توانائی ایک دوسرے کے متضاد تصوّر تھے۔ مادّے کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ ایک مجسّم شے ہے، جو ایک محدود فضا کو بلا شرکت غیرے احاطہ کرتی ہے جس کا ایک مستقل وزن ہوتا ہے جس کو کم بیش یا معدوم نہیں کیا جا سکتا، جب کوئی مادّی شے حرکت کرتی ہے تو وہ ایک ہی خط میں کسی ذرّے کی طرح حرکت کرتی ہے۔ آواز یا روشنی کی موجوں کی طرح پوری فضا میں نہیں پھیل جاتی ــــــ

اس کے برخلاف روشنی اور توانائی کے متعلّق یہ خیال تھا کہ نہ تو وہ کوئی مجسّم شے ہے اور نہ کسی محدود فضا کو بلا شرکت غیرے گھیرتی ہے۔ اس کا کوئی وزن نہیں ہوتا اور وہ ذرّے کی طرح حرکت نہیں کرتی بلکہ موجوں کی شکل میں آگے بڑھتی ہے۔

جدید طبعیات میں مادّے اور توانائی کا یہ اختلاف ختم ہوگیا اور تجربوں سے ثابت ہوگیا

ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی مختلف شکلیں ہیں کبھی مادّہ توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور کبھی توانائی مادّے میں۔ جب کوئی ذرّہ حرکت کرتا ہے تو اس کے وزن میں اضافہ ہوتا ہے اور جب وہ ذرّہ ساکن ہوتا ہے تو اس کا وزن کم ہو جاتا ہے۔ ایک مادّی شے کبھی ذرّے کی طرح ایک خط میں اور کبھی موجوں کی طرح پھیلتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔

مادّے کے توانائی میں منتقل ہونے کا یہی راز اصل اصول ہے جس کی بناء پر جوہری بم بنایا گیا ہے۔

جوہر یا (AtoM) کے متعلق ۱۸۹۵ء تک سمجھا جاتا تھا کہ وہ مادّے کا سب سے چھوٹا ذرّہ ہے جس کی مزید تقسیم نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اس صدی کے آغاز میں پتا چلا کہ ہر جوہر کے اندر بہت سے دوسرے ذرّے ہوتے ہیں جو تین قسم کے اجزا الیکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جوہر کا مادّہ مسلسل پھیلا ہوا نہیں ہوتا بلکہ یہ ذرّے اس کے اندر نظام شمسی کی طرح ترتیب دیئے ہوئے ہوتے اور حرکت کرتے رہتے ہیں ہر جوہر کا مرکزی حصّہ جس کو NUcLeUS کہا جاتا ہے۔ اس کی ساری توانائی اور مادّے کا مرکز ہوتا ہے اور اسی کی شکست و ریخت سے جوہر کی ماہیّت بھی بدل جاتی ہے اور جوہری توانائی بھی حاصل ہوتی ہے۔

کیمیائی عنصر سے متعلق سابقہ تصوّر یہ تھا کہ وہ ایک خاص قسم کے مادّے سے متعلق ہوتے ہیں اور ان کی ہیئت اور ماہیّت ہمیشہ ایک ہی ہوتی ہے، جیسے ہائیڈروجن یا آکسیجن یا سوڈیم وغیرہ، چند سال قبل تک خیال تھا کہ ایسے کیمیائی عنصروں کی تعداد ۹۲ ہے اور ایک عنصر کو دوسرے عنصر میں تبدیل کرنا ہی امر محال ہے جس کی تلاش میں ازمنۂ وسطیٰ میں متعدد کیمیا گروں نے اپنی عمریں ضائع کی تھیں، لیکن آجکل یہ کیمیاگری لیبارٹری میں ہر وقت کی جا رہی ہے اور بعض عناصر میں قدرتی طور پر ہوتی رہتی ہے۔ ایک عنصر کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں جن کو IsotoPE کہا جاتا ہے اور

لیبارٹری میں مصنوعی طور پر I SOTOPE تو کیا نئے عنصر بھی بنائے جا رہے ہیں اور گذشتہ چند سال میں ۱۲ سے زیادہ نئے عنصر یورنیم کے اوپر بنائے جا چکے ہیں ——

مذکورہ بنیادی تصوّرات کے بدلنے کی وجہ سے علّت و معلول کے منطقی مفہوم میں بھی فرق آ گیا ہے۔ نیوٹن کی میکانکس کا ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ اگر کسی شے کی موجودہ حالت معلوم ہو تو اس کی سابقہ یا آئندہ حالت قطعی طور پر متعیّن ہو جائے گی اور محض قوانین حرکت کی بناء پر علم ریاضی کی مدد سے اس کی تمام حالتوں کو ازل تا ابد یہ معلوم کیا جا سکتا ہے سائنس کا یہی مسئلہ تھا جو مادّہ پرستوں کے لئے حکم فیصل کا کام دیتا تھا اور جس کی بناء پر وہ کسی خالقِ کائنات کے تصوّر کو غیر ضروری قرار دیتے تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک کائنات کی حالت ہر لمحہ متعیّن ہے اور وہ اس کے مطابق خود بخود تشکیل پاتی چلی جا رہی ہے۔

لیکن مادّہ اور توانائی اور ذرّہ اور موج کی ثنویت (DUALity) اور زمان و مکان کی اضافیت کی بناء پر ۱۹۲۷ء میں ہائی زن برگ نے ثابت کیا کہ مظاہر فطرت میں تعین یا جبر نہیں بلکہ عدم تعیّن یا امکان پایا جاتا ہے۔ اور ایک ذرّہ کسی وقت بھی بے شمار ممکنہ حالتوں میں سے کوئی ایک حالت اختیار کر سکتا ہے۔ اسی طرح قوانین قدرت تعینی نہیں بلکہ اوسطی (StATIStiCAL) ہو جاتے ہیں۔ اور انیسویں صدی کے سائنس میں جو کٹر قسم کی سائنس پائی جاتی تھی، باقی نہیں رہتی ——

اسی کے ساتھ آیۃ شریف " اللّٰہُ نور السمٰوٰت والارض " کا مفہوم بھی سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ جب مادّہ اور روشنی میں غیریّت نہیں رہی تو مادّی اشیاء کے خالق کا غیر مادّی ہونا خلافِ قیاس نہیں ہو سکتا اور دہریوں کے استدلال میں کوئی جان باقی نہیں رہتی ——

۱۹۲۲ء - ۱۹۲۳ء کے بعد جب نیلس بوہر کے کوانٹم نظریئے میں یکے بعد دیگرے متعدد غلطیاں اور خامیاں منکشف ہونے لگیں تو ۱۹۲۵ء - ۱۹۲۶ء میں نئی کوانٹم

میکانکس کی بنیاد رکھتے ہوئے ہائی زن برگ اور ڈیراک نے بتایا کہ یہ غلطیاں اس وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں کہ سائنس کا مقصد اور اس کا طریق کار صحیح طور پر متعیّن نہیں کیا گیا۔ سائنس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ مظاہر فطرت کی انتہائی حقیقت یا غایت معلوم کرے بلکہ سائنس کا کام صرف یہ ہے کہ ان اشیاء اور مظاہر میں باہمی ربط اور تعلّق کا پتہ چلائے۔ ڈیراک نے مثال کے طور پر یہ بتایا ہے کہ سائنس میں یہ سوال کرنا بے معنی ہے کہ برق کی حقیقت یا ماہیّت کیا ہے، بلکہ صحیح سوال یہ ہوگا کہ قوّتِ برق کا عمل کیا ہے۔ اس طرح سائنس کا طریق کار اور دائرۂ عمل نئے سرے سے متعیّن ہو جاتا ہے اور فلسفہ یا مذہب کے ساتھ کسی تضاد کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ــــــ

اس سے بھی آگے چلئے تو ہم دیکھیں گے کہ سائنس کے اساسی تصوّر میں ایک بہت بڑا انقلاب رونما ہوا۔ یہ انقلاب سائنس کے بنیادی قوانین کی تشکیل سے متعلّق ہے۔ جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے۔ انیسویں صدی کے ختم تک سائنس کے تمام بنیادی قوانین استقرائی یعنی INBUCtivE طریقے پر اخذ کئے جاتے تھے مثلاً قانونِ تجاذب ہی کو لیجئے۔ یہ قانون کہ کائنات کے کسی دو مادّی اجسام کے درمیان ایک معیّن مقدار کی تجاذبی قوّت پائی جاتی ہے، خاص مثالوں کی مدد سے اخذ کیا گیا تھا۔ اسی طرح برقی مقناطیس کے قوانین یا روشنی کے منعکس یا منتشر ہونے کے قوانین سب استقرائی تھے ــــــ

لیکن ۱۹۰۵ء میں آئن سٹائن نے اپنے نظریۂ اضافیت کی تشکیل کے لئے جو قانون اور یا مفروضہ اختیار کیا وہ استقرائی نہیں بلکہ علمیاتی EPISTEMOI-GOCAL- یا فلسفیانہ ہے۔ اس اصول کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ طبیعی قانون ایسے ہونے چاہئیں کہ وہ تمام مشاہدین کے لئے غیر متغیّر ہوں۔ خواہ یہ مشاہدین کسی قسم کی حالتِ حرکت یا سکون میں کیوں نہ ہوں۔ یہ مفروضہ جس پر نظریۂ اضافیت کی تشکیل کی گئی ہے، استقرائی نہیں ہے

اسی طرح عدمِ تعیّن کا اصول جس پر جدید کوانٹم میکانکس کا دار و مدار ہے، استقرائی بلکہ علمیاتی ہے۔

پروفیسر ایڈنگٹن نے سائنس کی اس نئی تحریک کو ایک بڑی دل چسپ مثال کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فرض کرو کہ ایک سائنس دان کسی تالاب سے ایک جال کے ذریعے مچھلیاں پکڑ رہا ہے۔ تاکہ ان مچھلیوں کے طول سے متعلق کوئی قانون بنا سکے۔ جب تمام دن کی محنت کے بعد وہ ان مچھلیوں کو جو پکڑی گئی ہیں، ناپتا ہے تو بزعمِ خود ایک قانون کا انکشاف کرتا ہے کہ اس تالاب میں کوئی مچھلی ایک انچ طول سے کم نہیں ہے۔ اس کے اس فعل کو جب کوئی دوسرا سائنسدان دیکھتا ہے تو اس کو بتاتا ہے کہ تمہیں قانون کے اخذ کرنے کے لئے تمام دن اتنی محنت کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ تم محض اپنے جال کو دیکھ کر جس کے تمام خانے ایک انچ طول کے ہیں، شروع ہی میں یہ نتیجہ اخذ کر سکتے تھے کہ اس جال سے کوئی ایسی مچھلی نہیں پکڑی جا سکتی جس کا طول ایک انچ سے کم ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قانونِ فطرت کی تشکیل کے لئے علم کی نوعیّت اور علم حاصل کرنے کے طریقوں پر غور کر کے استقرائی قوانین کی بہ نسبت زیادہ دُور رس اور دیرپا قانون بنائے جا سکتے ہیں، کیونکہ استقرائی قوانین تو ایک بھی مخالف مثال کی بنا پر غلط ثابت ہو سکتے ہیں، جیسا کہ نیوٹن کے قانونِ تجاذب کے متعلق معلوم ہوا کہ سیارۂ عطارد کا مدار اس قانون کی بنا پر غلط حاصل ہوتا ہے تو اس قانون کو ترک کر دینا پڑا — (اقبال اور فلسفۂ زمان و مکان ص ۲۴)

خُدا کی عظمت
اور
سائنس کا عجز!

سائنسدانوں کی جماعت اپنے آلات سے مسلّح ہو کر اپنی اپنی تجربہ گاہوں میں بیٹھی تھی کہ خدا کے انکار کے لئے مواد فراہم کیا جائے۔ لیکن وہ خُدا کا اقرار کر کے اُٹھی، چنانچہ سر جیمز جینز مشہور سائنسدان نے خدا کا اقرار ان الفاظ میں کیا ہے: ــــــ

"انتہائی حقیقت ایک اور صرف ایک ہے ابدی اور کائناتی رُوح باقی سب اسی کی مخلوق ہیں ــــ"

ابتداءً خدا کے نام سے جو بُغض پیدا ہو گیا تھا وہ خدا کے اقرار کے باوجود اب بھی قائم ہے اس آخری حقیقت کو خُدا کہنے کے باوجود کوئی اَبدی رُوح کہتا ہے تو کوئی (ULtimate REALity) اور کوئی (UNiVERSAL MiND) لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سارے الفاظ کا مفہوم وہی ہے جس کے لئے لفظ خُدا استعمال ہوتا ہے۔ وہ خدا کے لفظ سے اس لئے گھبراتے ہیں کہ اس کا صحیح تصوّر صرف اسلام ہی پیش کر سکتا ہے۔ اور یہ لوگ اسلام لانے سے جھجکتے ہیں ــ

نیوٹن کا قانونِ کشش (LAW OF GRAVITATION) ہو یا ماکس پلانک (MAX PLANK) کا کوانٹم نظریہ یا ڈارون کا نظریہ ارتقاء (THEORY-EVOLUTION) ہو یا انتہائی حقیقت (ULLTIMATE REALITY) کی تلاش یہ سب اُونچی باتیں ہیں جو عام لوگوں کی سمجھ سے باہر ہیں کوانٹم نظریہ نے نیوٹن کے قانونِ کشش کو رَد کر دیا ہے اور ڈارون کا نظریہ ارتقاء اب تک ثابت نہ ہو سکا لیکن عام پڑھے لکھے لوگوں کی ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ ان چیزوں کا ذکر کچھ اس انداز سے کرتے ہیں۔ گویا مسلّمہ حقیقتیں ہیں۔ اس مرعوبیت کی وجہ سائنسی ایجادات ہیں جیسا کہ فلپ فرانک نے کہا ہے۔

" سائنس کے نظریات سے زیادہ عوام و خواص کے ذہنوں کو سائنسی ایجادات نے مرعوب کر رکھا ہے "۔۔۔۔

عوام کی اس ناواقفیت اور مرعوبیت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مذہب کے مخالفین نے سائنس دریافتوں سے ایسے اُلٹے پلٹے نتیجے اخذ کئے تاکہ خدا کی خالقیت سے بچا جا سکے۔ چنانچہ سر آرتھر کیتھ (SIR AKTHER KEITH) نے اس ذہنیت کی طرف اشارہ کیا ہے ۔۔۔۔ " ارتقاء (EVOLUTION) نہ صرف ناثابت بلکہ ناقابلِ ثبوت ہے لیکن ہم اس کو مانتے ہیں اس لئے کہ اس کا واحد بدل نظریۂ تخلیق ہے جس کی تفہیم ہمارے لئے بڑی مشکل ہے ۔۔۔۔

ربّ العالمین کی تشریح

کائنات کا نظامِ ربوبیت کس طرح چل رہا ہے؟

جس زمین، چاند اور سورج کو ہم کُل کائنات سمجھتے تھے وہ سارا نظامِ شمسی کُل کائنات کے ایک بڑے محیط میں صرف ایک ذرہ کے برابر ہے۔ ہماری زمین جب نظامِ شمسی میں شامل ہے اس کی وُسعت کا یہ حال ہے کہ ہماری زمین کا قطر تو کُل بارہ ہزار سات سو چون کلومیٹر ہے جبکہ جیوپیٹر ستارے (JUPiTER) کا قطر ایک لاکھ بیالیس ہزار سات سو چون کلومیٹر اور نظامِ شمسی کے مرکز یعنی سورج کا قطر ۱۴ لاکھ کلومیٹر ہے۔ یعنی زمین سے ۱۰۹ گُنا بڑا ہے ـــــ

قطر کی یہ وسعت تو کچھ بھی نہیں جبکہ اس کے مقابل اگر ایک لاکھ کو ۹۵ کھرب سے ضرب دی جائے تو اس کے حاصل ضرب کے برابر کلومیٹر کا قطر ہماری کہکشاں کا ہے۔ جس کا عرض ۲۰ ہزار ضرب ۹۵ کھرب کلومیٹر ہے اس کو (MiLKYWAY) یعنی دودھیاں کہکشاں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسی کہکشاں میں ہمارا نظامِ شمسی شامل ہے۔ اس کہکشاں میں ایک لاکھ ملین یعنی سو ارب ستارے پائے جاتے ہیں۔ ہمارا پورا نظامِ شمسی اس کہکشاں کے ایک چھوٹے سے کونے میں پڑا ہے ـــ اب تک انسانی مشاہدہ ایسی ایک سو ارب کہکشاؤں کا سُراغ لگا چُکا ہے ـــــ

یہ تو تھا جسامت کا اندازہ اب فاصلوں کا اندازہ کیجئے کہ زمین، سورج سے صرف

۱۵ کروڑ کلومیٹر دُور ہے جبکہ نیپچون ستارہ (NEPtUNE) سورج سے ۴ ارب ۹۴ کروڑ ۵۰ لاکھ کلومیٹر دُور ہے۔ پلوٹو (PLUtU) کا سُورج سے فاصلہ ۵ ارب ۹۱ کروڑ کلومیٹر ہے۔ یہ فاصلے اس وقت بہت معمولی رہ جاتے ہیں۔ جب ملکی وے (MilKYWAY) کا فاصلہ ۹۲ ہزار ضرب ایک ہزار ضرب ارب کلومیٹر کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہکشاؤں کے فاصلے جو اَب متعیّن ہو رہے ہیں وہ ہندسوں یا لفظوں میں پُورے نہیں لکھے جا سکتے۔

شاید اس بات سے کچھ اندازہ لگایا جا سکے کہ اضافت کے حساب سے کائنات کچھ اتنی جگہ میں سمائی ہوئی ہے کہ مکعب سنٹی میٹر میں ایک کا ہندسہ لکھیں اور پھر اس کے آگے ۸۴ صفر لگائیں یا اسی پیمائش کو مکعب کلومیٹر میں لیا جائے تو ایک کے آگے ۶۹ صفر لگائے جائیں تب حساب پُورا ہو۔ اس کے باوجود کائنات محدود ہے اس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، جسامت اور فاصلوں کے اعداد و شمار سے آپ اللہ تعالیٰ کا خیال کیجئے کہ وہ کس قدر عظیم ہے اور پھر سوچیئے کہ کیا ہم اللہ کو واقعتاً اتنا ہی عظیم سمجھتے ہیں اور اس کی عظمت و جلالت کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار کرتے ہیں ــــــــــ

اب ذرا اور آگے بڑھیئے اور وقت کا اندازہ لگایئے۔ جدید زمانے کے ریڈیائی ہیئت دانوں نے ایک کہکشانی نظام کا مشاہدہ کیا ہے۔ اس کے متعلّق اندازہ ہے کہ اس کی جو شعاعیں اس سے چار ارب نوری سال سے بھی پہلے روانہ ہوئی تھیں وہ آج ہم تک پہنچی ہیں ــــــــ ستاروں کا فاصلہ ماپنے کے لئے ہمارے اعداد و شمار ناکافی ہیں اس لئے نوری سال کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ نور یعنی روشنی ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر سفر طے کرتی ہے۔ اس طرح ایک سال میں اس کا سفر تقریباً ۹۵ کھرب کلومیٹر ہوا۔ یہ فاصلہ نوری سال کا ہے۔ اَب ۴ ارب کو ۹۵ کھرب سے ضرب دیجئے تو کہکشاں کا ایک سرے سے دوسرے تک کا فاصلہ یا وقت معلوم ہوگا کہ ایک روشنی جو ایک کہکشاں سے چلی ہے وہ ہمارے کُرہ تک کتنے وقت میں پہنچی۔ تازہ ترین مشاہدہ میں ایسی کہکشاں بھی دیکھی گئی ہے جس کی روشنی

ہم تک دس ارب نوری سال میں پہنچی ہے یعنی اس نے ۱۰ ضرب ۹۵ کھرب کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا ہے ——

مزید دیکھئے! سائنس دانوں کا خیال ہے کہ کائنات میں ایک مرکز کہکشاں ہے جس کے گرد تمام ستارے چکر کاٹ رہے ہیں ان کا چکر" تیس کروڑ سال میں پورا ہوتا ہے۔ یہ تو آپ کے لئے بہت معمولی بات ہوگی کہ ہمارے سورج کی عمر کا اندازہ پانچ ارب سال ہے جبکہ کائنات کی عمر تقریباً پندرہ ارب سال ہے ——

ہم ان اعداد و شمار سے صرف اتنا بتانا چاہتے ہیں کہ ساری کائنات جو اللہ تعالیٰ کی پیدا پیدا کردہ ہے۔ وقت۔ حجم اور فاصلہ کے اعتبار سے کس قدر لامحدود ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ازلی و ابدی عظمت و کبریائی کا انداز لگانے کے لئے وقت کے یہ سارے پیمانے، حجم کے یہ کُل اندازے اور فاصلوں کی یہ تمام پیمائش بالکل ناکافی ہیں ——

اللہ تعالیٰ زمان و مکان کی جملہ وسعتوں سے بھی بہت بلند و برتر ہے۔ اس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔ اور جو نظم حکمت صناعی اور باہمی مناسبت ان اربوں کہکشاؤں اور ان کے گرد گردش کرنے والے ستاروں یا سیاروں میں پائی جاتی ہے اور ہم زمین پر بیٹھے ہوئے اتنی دور دراز دنیاؤں کے مشاہدے کرتے، ان کے فاصلے ماپتے اور ان کی رفتار کے حساب لگاتے ہیں تو اس سے ہم کو خدا کی عظمت اور اس کی قدرت و حکمت کا اندازہ ہونا چاہیئے اور یہ مشاہدہ کرنا چاہیئے کہ اتنی بڑی لامحدود بڑی لامحدود کائنات کی ایک ایک چیز باہمی جذب و کشش کے قانون میں کس قدر جکڑی ہوئی ہے کہ بڑے سے بڑا کرہ اپنے مدار سے ایک اِنچ اِدھر اُدھر نہیں ہوتا۔ اور ہر چھوٹے سے چھوٹا ذرہ قاعدے اور قانون کے تحت مکمل نظم و ضبط اور منصوبہ بندی کے تحت مصروف کار ہے۔ ہم جوں جوں اپنے مشاہدات میں آگے بڑھتے جائیں گے ہمارا ایمان پختہ سے پختہ ہوتا جائے گا ——

مادّی انسان کے لئے غیر مادّی خدا کا مشاہدہ ناممکن ہے، پھر بھی اس کی بنائی ہوئی

چیزوں کی معلومات اس کی عظمت اور کبریائی کا تصوّر دینے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ خدا کی عظیم الشان تخلیق ایک طرف اس کی عظمت کا نقش دل و دماغ پر بٹھاتی ہیں اور دوسری طرف انسان کی کم مائیگی کا احساس دلاتی ہے ——

پروفیسر کاسکی نے خبر دی ہے کہ ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء کو صبح ۳ بج کر ۱۴ منٹ پر سورج میں ایک زبردست دھماکہ ہوا اور اس کی سطح پر ایک بہت بڑا شگاف پڑ گیا۔ یہ شگاف اتنا بڑا ہے کہ اس میں ہماری زمین جیسی تین زمینیں سما سکتی ہیں۔ یہ وہی سورج ہے جو روزانہ مشرق سے طلوع ہو کر اپنی پوری چمک دمک دکھلا کر مغرب میں ڈوب جاتا ہے۔ چونکہ یہ روزانہ کا معمول ہے اس لئے ہماری توجّہ کا مرکز نہ بن سکا۔ اور نہ ہم نے کبھی یہ سوچا کہ یہ سورج کیا ہے؟ کیسے مسلسل چمکتا رہتا ہے؟ یوں تو دیکھنے میں عام نگاہوں سے یہ سورج ہماری زمین سے بہت بڑا ہے۔ اتنا بڑا کہ ہماری زمین جیسی تیرہ لاکھ زمینیں اس میں سما سکتی ہیں۔ اس کی تیز چمک کی وجہ سے اندر کے حالات بہت کم معلوم ہو سکے ہیں ——

سورج گہن کے وقت جب سورج کی ٹکیہ چاند کی آڑ میں آجاتی ہے تو سورج کے کنارے کا حصّہ آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ موجودہ تحقیقات کے مطابق سورج کی ٹکیہ کے چاروں طرف دو سو میل ایک فضا ہے جس کو فوٹو اسفیر (PHOTO SPHERE) کہتے ہیں —— اور اس کے اوپر دو مزید تہیں ہیں جن کو کرونو اسفیر (CRONO SPHERE) اور بالکل باہر کی تہہ کو کورونا (CORONO) کہتے ہیں۔ سورج کی تشتری پر بہت سے دھبے حرکت کرتے ہوئے دکھلائی پڑتے ہیں جن کو سن اسپاٹ کہتے ہیں ——

ان دھبّوں کا قطر (DIAMETER) چند سو میل سے لے کر ساٹھ ہزار میل تک ہوتا ہے۔ سورج کے کنارے والے حصّہ سے لمبی لمبی لپٹیں نکلتی ہیں جن کو اسپیکیولیس (ICULES-OSP) کہتے ہیں۔ یہ سیکڑوں میل اوپر اُٹھتے ہیں۔ اور چار پانچ منٹ کے اندر واپس آجاتے ہیں۔ اس مختصر بیان سے سورج کے بارے میں تھوڑا سا اندازہ ہو سکتا ہے۔ رہا اس کی گرمی کا

سوال تو بقول سر جیمز جینز (SiR JAMES JEANS) کے سورج کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جو صرف آلپین کے سر کے برابر ہو اتنی گرمی رکھتا ہے کہ یہی ٹکڑا ایک ہزار میل کی دُوری پر رکھ دیا جائے تو انسان کو ہلاک کر دینے کے لئے کافی ہے ـــــ

کائنات میں لاتعداد سورج ہیں ہمارا سورج بھی انہیں میں سے ایک ہے مگر چونکہ یہ سب سے قریب ہے اس لئے بہت چمکتا ہُوا دکھلائی دیتا ہے۔ اور دوسرے سُورج بہت دُور ہیں۔ اس لئے ان کی چمک اتنی تیز نہیں ہوتی۔ ان دُور دراز سورجوں کی دُوری کروڑ یا ارب دو ارب میل نہیں ہے بلکہ ہمارے پاس اتنا بڑا کوئی عدد ہی نہیں ہے جس سے ان کی دُوری کو بتلایا جاسکے، چنانچہ ان کی دُوری کو ناپنے کے لئے ایک مستقل اکائی (Unit) مانی گئی جس کو نوری سال (LiGHt YEAR) کہتے ہیں ـــــ

روشنی بہت تیز چلتی ہے یعنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار (۱۸۶۰۰۰) میل چلتی ہے تو ایک منٹ میں اس کا ساٹھ گنا چلے گی (۶۰ ضرب ۱۸۶۰۰۰) میل اور ایک گھنٹہ میں (۶۰ ضرب ۶۰ ۱۸۶۰۰۰) میل چلے گی اس طرح ایک دن میں (۲۴ ضرب ۶۰ ضرب ۶۰ ضرب ۱۸۶۰۰۰) میل چلے گی۔ اسی رفتار سے پُورے ۳۶۵ دن چلتی رہے تو جو فاصلہ طے کریگی اس کو ایک نُوری سال (LiGHt YEAR) مانا جاتا ہے ـــــ

ان دُور دراز سورج تک روشنی پہنچنے میں سینکڑوں سال لگ جاتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ سورج ہم سے کتنی دُور ہیں۔ بعض سُورج ہمارے سورج سے بہت زیادہ روشن ہیں جو نیلے رنگ کے دکھلائی دیتے ہیں اور بعض ہمارے سورج سے کم روشن ہیں جو سُرخ رنگ کے دکھلائی دیتے ہیں۔ انہیں سورجوں میں ریگل (REGAL) بھی ایک سورج ہے۔ جو ہمارے سورج سے پندرہ ہزار گنا زیادہ روشن ہے۔ اتنا ہی ایک دوسرا سورج ہے جو جسامت میں اتنا بڑا ہے کہ اس میں ہمارے سورج جیسے تین کروڑ ساٹھ لاکھ سورج رکھے جاسکتے ہیں ـــــ ہر سورج کے گرد بہت سے سیارے (PLANEtS) بھی ہوتے ہیں جو اپنے

سُورج کے اِرد گرد گھومتے رہتے ہیں۔ سورج اور ان کے گرد گھومنے والے سیّاروں کے جھُرمٹ کو نظامِ شمسی (SOLAR SYSTEM) کہتے ہیں جس نظامِ شمسی میں ہماری دُنیا شامل ہے اس میں کُل نو سیّارے شامل ہیں جن میں قریب ترین مرکری (MERCURY) اور بعید ترین پلوٹو (PLUTO) ہے جس کی سُورج سے دُوری چار اَرب ساٹھ کروڑ (۴۶۰۰۰۰۰۰۰۰) میل ہے ــــ ہمارے نظامِ شمسی کے بارے میں یہ مختصر معلومات اس بات کے لئے کافی ہیں کہ ہم کو اندازہ ہوجائے کہ یہ نظامِ شمسی کتنا بڑا ہے۔ اتنے بڑے نظامِ شمسی میں ہماری زمین کی کیا حیثیّت رہ جاتی ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ کائنات میں نظامِ شمسی بھی ایک نہیں بلکہ لاتعداد نظامِ شمسی ہیں۔ یہ نظامِ شمسی جگہ جگہ جھرمٹ بناتے ہیں۔ جن کو گلیکسی (GLAXY) کہتے ہیں۔ گلیکسی بھی لاتعداد ہیں جس گلیکسی میں ہمارا نظامِ شمسی ہے اس میں تین اَرب (۳۰۰۰۰۰۰۰۰۰) سورج مع اپنے نظامِ شمسی کے موجود ہیں۔ اور ان تین اَرب سورجوں میں جو سورج ہماری زمین سے زیادہ قریب ہے وہ بھی اتنا دُور ہے کہ اس کی روشنی ہم تک پہنچنے میں چار سال لگ جاتے ہیں۔ بہت سے گلیکسی مِل کر نیبولا (NEBULA) بناتے ہیں۔ اور کائنات میں نیبولا بھی ایک دو نہیں اب تک ان کی تحقیقات کے مطابق بیس لاکھ نیبولا کا پتہ لگایا جا چُکا ہے۔ جو نیبولا ہماری زمین سے زیادہ قریب ہے وہ بھی اتنا دُور ہے کہ اس کی روشنی ہم تک پہنچنے میں دس لاکھ سال لگ جاتے ہیں۔ جُوں جُوں زیادہ طاقت وَر دُوربینیں بنتی جارہی ہیں نیبولا کی تعداد کی جانکاری بھی بڑھتی جارہی ہے ــــ

سر جیمز جینز (SIR JAMES JEANS) نے صحیح کہا تھا "دُنیا کے سارے سمندروں کے ساحلوں کے بالو کے ریزے کون شمار کرسکتا ہے اور وہ کون ساعدد ہوگا جو اس تعداد کو ظاہر کرسکے؟ ایک مٹھی بالو کے ریزے شمار سے باہر ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ آسمان کے تارے ہیں۔"

یہ کائنات کتنی بڑی ہے؟ اس کا تو اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک

طرف اپنی حقیر ہستی کو دیکھتا ہے اور دوسری طرف یہ وسیع وعریض کائنات، دُنیا نظامِ شمسی گلیکسی اور لاتعداد نیبولا تو بے اختیار بول اُٹھتا ہے "کائنات کا خالق کتنا عظیم ہے"

وہ سوچنے لگتا ہے کہ اتنی بڑی کائنات کا خالق کیا کچھ ہوگا، اس کی عظمت اور کبریائی کا تصوّر بھی ذہنوں میں نہیں سما سکتا۔ انسان کو اپنے علم کی محدودیت کا احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ دُنیا کے بارے میں کتنا کم جانتا ہے ——

نظامِ شمسی کے بارے میں تو اس کی معلومات اور بھی کم ہیں، گلیکسی اور نیبولا کے بارے میں تو اس کی معلومات صفر کے برابر ہے کائنات کیا ہے؟ —— کتنی بڑی ہے؟ اور پھر اس عظیم کائنات کا خالق کیا کچھ ہوگا؟ —— اور اس کا تصوّر تو انسان کر ہی نہیں سکتا۔ اس لئے جو تصوّر اللہ کے پیغمبروں نے دیا ہے وہی صحیح ہے ——

ساری کائنات کو کس نے تھام رکھا ہے!

سورۃ فاطر میں فرمایا گیا: ـــــ اِنَّ اللہ یمسک السّمٰوٰت والارض ان تزولا ولئن زالتا ان امسکھما من احد من بعدہ (سورۃ فاطر ۴۱)

اس کا تفسیری ترجمہ یہ ہے: ـــــ

"یعنی اسی (اللہ) کی قدرت کا تصرّف ہے جو اتنے بڑے بڑے کُرّوں کو اپنے مرکز سے ہٹنے اور اپنے مقام و نظام سے اِدھر اُدھر سرکنے نہیں دیتا۔ اور اگر بالفرض یہ چیزیں اپنی جگہ سے ٹل جائیں تو پھر بغیر خدا کے کس کی طاقت ہے کہ ان کو قابو میں رکھ سکے ـــــ

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اجرامِ سماویہ محقّقین جدید کی تحقیقات کے مطابق مختلف نظاموں سے وابستہ ہیں۔ ہر چند اجرام کا علیحدہ ایک مستقل نظام ہے جس کے ماتحت وہ مصروفِ گردش رہتے ہیں۔ یہ مختلف نظام ایک دوسرے سے ہزاروں ملین نوری سال کی رفتار کی دُوری رکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ اجرام سماویہ کے بُعد کا اندازہ لگانے کے لئے ماہرینِ فلکیات نے

روشنی کی رفتار کو معیار بتایا ہے۔ چنانچہ ان کے حساب کے مطابق روشنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کی مسافت طے کرتی ہے۔ زمین سے جو سیارہ سب سے زیادہ قریب ہے اس کی روشنی زمین پر تقریباً ساڑھے چار سال میں پہنچتی ہے ــــــ

لہٰذا فلکیات کی اصطلاح میں کہا جائیگا کہ وہ ہم سے نوری ساڑھے چار سال دور ہے۔ بعض سیارے جو زیادہ دور ہیں ان کی روشنی ہم تک ایک ہزار نوری سال بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت میں پہنچتی ہے۔ اس قدر فاصلے کے باوجود یہ سب نظام ایک نظامِ اعلیٰ کے تحت ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ ان میں آپس میں کوئی تصادم نہیں ہوتا۔" ان نظامات سیارگان" میں ہی سے ایک نظام وہ ہے جس سے ہمارا تعلق ہے جسے نظامِ شمسی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ شمس (سورج) اس نظام کا مرکز ہے اور دوسرے سیارے جن میں ہماری دنیا کا سیارہ بھی شامل ہے۔ اس کے گرد اپنے اپنے انداز میں گھومتے ہیں۔ سورج کے گرد گھومنے والے یہ سیارے اپنے حجم اور بعد میں مختلف ہیں۔ تاہم یہ سب اپنی مقررہ رفتار سے اپنے مخصوص حلقہ گردش میں اس باقاعدگی کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں کہ نہ ان کی رفتار میں ایک منٹ کا فرق ہو سکتا ہے اور نہ ان کے مدار میں ایک انچ کا۔ ان سب کو اپنی اپنی معین جگہ دائرو سائر رکھنے کے لئے جو سنّتِ الٰہیہ کام کر رہی ہے۔ اسے اصطلاحِ فلکیات میں جاذبیتِ عامہ کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگر یہ جاذبیت ان کا صحیح توازن قائم نہ رکھے تو یہ عظیم کرے (اجرامِ سماویہ) ایک دوسرے سے ٹکرا کر چکنا چور ہو جائیں اور سارا نظام درہم برہم ہو جائے ــــــ

الغرض آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ عزّوجل کے ہی تصرّف قدرت کی کارفرمائی ہے کہ اس نے اجرامِ سماویہ کے ہر نظام کے مختلف عظیم کُروں کو اور پھر تمام نظاموں کو جن میں ہمارا نظامِ شمسی بھی شامل ہے ایک سنّتِ محکمہ سے باہم مربوط و منظّم کر رکھا ہے۔ اگر اس کی قدرت و حکمت [illegible] سہارا اٹھالے تو کائنات کی کونسی طاقت

ہے جو اس مربوط نظام کو قابو میں رکھ سکے۔ چنانچہ جب وہ ایسا کرنا چاہے گا تو ہوگا اور اسی کا نام قیامت ہے ـــــ

اور دوسری آیت :ـــــ

"ویمسک السماء ان تقع علی الارض الا باذنہ"

(ترجمہ) اور اس نے آسمان کو زمین پر گرنے سے روک رکھا ہے مگر جب اس کا حکم ہو تو گر جائے گا ـــــ"

اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے۔ بہرحال اجرام سماویہ کا یہ محیر العقول نظام اہلِ دانش و بینش کے لئے " اللہ جلّ شانہٗ " کی وحدانیت اس کی عظمت و قدرت اور اس کی وسعت و رحمت کا بہترین نشان ہے۔ جنہوں نے اسے دل کی آنکھوں سے دیکھا وہ تو۔

"سبحٰن ربّ السمٰوٰت والارض ربّ العرش عمّا یصفون"

کے والہانہ نغموں میں گم ہو ہی گئے ـــــ

ہندوستان کے ایک مشہور مستشرق کی برطانیہ کے مشہور سائنس دان سر جیمز سے ملاقات ہوئی۔ وہ اس ملاقات کے تاثرات کو اس طرح بیان کرتے ہیں :ـــــ

"چائے کی میز پر بیٹھ کر سر جیمز نے اجرام فلکی کے مہیب نظام ان کی پیچیدہ شاہراہوں ان کی تندی پرواز ان کے محیر العقول حجم اور بے کراں وسعتوں پر وہ ایمان افروز بحث کی اور اللہ کی حکمت و دانش پر اس رنگ میں روشنی ڈالی کہ میں وجد و حیرت کی دوگانہ کیفیت میں کھو گیا ـــــ اور خود سر جیمز کا یہ حال تھا کہ وہ الٰہی دانش کی دہشت سے تقریباً لرز رہے تھے۔ اور ان کی آنکھیں سرخ تھیں اور سر کے بال سیدھے اٹھے ہوئے تھے ـــــ

(قاموس القرآن سجاد میرٹھی ۵۴، ۵۵)

تخلیقِ انسان کی

انفسی دلیل

اس کائنات میں سب سے بڑی حقیقت اور خالقِ کائنات کا شاہکار خود انسان کا اپنا وجود ہے جو اپنے جسم و جثہ کے اعتبار سے گو بہت بڑا نہیں مگر اس کی ساخت پر غور کیجئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس جیسی مشین آج تک کوئی نہیں بنا سکا نہ کبھی بنا سکے گا، پھر اربوں انسانوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی بالکل کاپی نہیں ہوتا۔ آپ اس سے اندازہ لگایئے کہ مرد کے مادۂ تولید کے ایک مکعب سینٹی میٹر میں ڈھائی کروڑ حیوانات منویّہ موجود ہوتے ہیں۔ اِن نصف ارب جرثوموں میں سے ہر ایک اپنے اندر ایک انسان بن جانے کی صلاحیّت رکھتا ہے ـــــ لیکن صرف ایک جرثومہ عورت کے بیضہ میں نفوذ پاتا ہے جو انسان کی تخلیق کا موجب بنتا ہے۔ اسی طرح ہر بالغ عورت کے مخصوص حصّے میں ۴ لاکھ ناپختہ انڈے موجود رہتے ہیں۔ مگر ان میں صرف ایک انڈا پختہ ہو کر اپنے مقرّرہ وقت پر نمودار ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ ۲۴ گھنٹے تک اس کے لئے تیاّر ہوتا ہے۔ اگر مرد کا کوئی جرثومہ آکر اس میں داخل ہو جائے تو وہ ایک مکمل حیاتی یونٹ بن جاتا ہے ـــــ اور

یوں عمل قرار پاتا ہے ـــــــ

جسمِ انسانی چھوٹے چھوٹے خلیات سے مِل کر بنتا ہے۔ ایک اوسط قد و قامت کے انسانی جسم میں ان خلیات کی تعداد ایک کروڑ ارب کے قریب بتائی جاتی ہے، ایک ہی خلیئے سے یہ تمام اربوں کھربوں خلیئے بنتے ہیں، کروڑوں خلیئے (CELLS) روزانہ ختم ہوتے رہتے ہیں اور دوسرے خلیئے اُسی وقت ان کی جگہ لے لیتے ہیں ـــــــ

اندازہ ہے کہ ہر سیکنڈ میں خون کے دس لاکھ سُرخ خلیات ختم ہو جاتے ہیں اور اسی تعداد میں نئے خلیات جنم لیتے ہیں۔ جسمِ انسانی میں بے شمار انواع و اقسام کے ان کھربوں خلیات کا آپس میں اتنا اشتراکِ عمل ہوتا ہے کہ ہر ایک اپنا کام ذمہ داری اور صحت کے ساتھ ادا کرتا ہے ہر خلیہ اپنے فرضِ منصبی کو جانتا ہے کہ کس طرح اس نے سارے بدن کی بہتری اور اچھائی کے لئے اپنے حصّہ کا کام کرنا ہے ـــــــ

یہ انسانی خلیئے ایک فصیل بند شہر کی طرح ہیں اس کی توانائی کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بجلی گھروں کی طرح جنریٹر کام کرتے ہیں۔ اس کی فیکٹریوں میں (پروٹین) لحمیات تیاّر ہوتے ہیں۔ اس تیار شدہ سامان یعنی کیمیاوی اجزاء کو جسم کے تمام حصّوں میں پہنچانے کے لئے ایک مواصلاتی نظام بھی ہے۔ خطرہ یا گزند پہنچنے پر اس کے سدِّباب کے لئے دفاعی اقدامات اور احکام صادر ہوتے ہیں ـــــــ

خلیئے مختلف شکل اور جسامت اور مختلف خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں، ان میں نازک خلیئے بھی ہیں جن کی جسامت ملی میٹر کے ۱۰ لاکھ ویں حصّے کے برابر ہیں پہلے تحقیق ہُوا تھا کہ ۷ سال میں اوّل خلیئے ختم ہو کر دوسرے خلیئے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اب معلوم ہوا ہے کہ ہر گیارہ مہینے بعد کھربوں خلیوں پر مشتمل یہ پُورے کا پُورا نظام بدل جاتا ہے ـــــــ

جسمِ انسانی کے جُملہ عجائبات کا بیان تو ناممکن ہے۔ چند حیران کُن حقائق درج ذیل ہیں آپ کو پڑھ کر تعجّب ہوگا کہ انسانی دماغ میں ۲۵ ارب سے زیادہ نیوٹران ہوتے ہیں جو

اپنا کام ہمہ وقت کرتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ نیند کے دوران بھی ان کا کام بھی اسی طرح جاری رہتا ہے۔ ساری دُنیا کا ٹیلیفون نظام بھی اس کے برابر کام نہیں کر سکتا، ذرا آگے بڑھئے اور قلب کو دیکھئے جو خود تو چھوٹا سا ہوتا ہے یعنی اندازاً نصف پونڈ کے برابر لیکن اس میں دو پمپ ہوتے ہیں ایک پھیپھڑوں کو خون کی ترسیل کے لئے تاکہ وہاں سے آکسیجن جذب کر سکے، دوسرا صاف شدہ خون کو سارے بدن میں دَوڑانے کے لئے ایک آدمی کی اَوسط زندگی میں دِل ۲ لاکھ ٹن خون پمپ کرتا ہے۔ اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ یہ اپنی بجلی بھی خود ہی پیدا کرتا ہے۔ ایک آدمی ستّر سال زندہ رہے تو دِل ۴ کھرب دفعہ دھڑکتا ہے ——

اسی طرح ایک آدمی کی اوسط زندگی میں پھیپھڑے ۵۰ کروڑ مرتبہ پھُولتے اور سکڑتے ہیں۔ انسان کی بنائی ہوئی کوئی مشین نہ ایسی مشقّت برداشت کر سکتی ہے اور نہ ہی بغیر مرمّت اتنے لمبے عرصے تک اپنا کام جاری رکھ سکتی ہے۔ علیٰ ھذا القیاس ایک انسانی آنکھ میں ایک کھرب سے زیادہ روشنی قبول کرنے والے ریشے ہوتے ہیں۔ یہ تعداد ان ستاروں کے برابر ہے جو ملکی وے نامی کہکشاں میں ہیں، انسانی بدن میں خون کی شریانوں کو اگر ناپا جائے تو ان کی لمبائی ۶۰ ہزار سے ایک لاکھ میل لمبی ریلوے لائن کے برابر نکلے گی ——

انسانی جسم ۳۰ کروڑ کیمیاوی اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ اگر آپ ان اعداد و شمار پر مشتمل اجزاء کو لفظوں میں لکھنا چاہیں تو اس سے دس ہزار ضخیم کتابوں کی ایک لائبریری بن جائے گی ——

نظامِ کائنات میں

رِزق کا اِنتظام

اِس کائنات کا ایک خالق ہے۔ اس کی ہر تخلیق حکمت کا شاہکار ہے، اس کی بے پایاں رحمت ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ انسان اس کائنات کی مرکزی شخصیّت ہے جس کو اس کے خالق نے اعلیٰ صلاحیتیں دے کر اس بھری دُنیا میں بھیجا ہے اور اس کی ضروریات کی فراہمی کا پُورا پُورا انتظام بھی کیا ہے۔ ہر آن اس کی ضروریات کی فراہمی پر اتنی طاقتیں لگی ہوئی ہیں کہ بے چارے انسان کو اس کی خبر بھی نہیں۔ زمین اپنے اندر ایک عظیم خزانہ رکھے ہوئے ہے جو برابر انسان کے کام آرہا ہے ـــــ

آسمان سے رحمت کی بارش ہو رہی ہے۔ ہزاروں چیزیں بالواسطہ اور بلاواسطہ ایک کی خدمت پر مامور ہیں جس کا انسان کو احساس بھی نہیں ہے ـــــ

گیہوں ہماری غذا کا ایک معروف جز، لیکن کم ہی لوگ اس پر غور کرتے ہیں۔ گیہوں کا ایک دانہ کیسے تیّار ہوتا ہے۔ اس کی تیّاری میں کتنی قوّتیں لگی ہوئی ہیں؟ ہر شخص جانتا ہے کہ اگر گیہوں کا دانہ پتھّر پر پھینک دیا جائے تو اس سے گیہوں کا ایک پودا بھی نہیں اُگ سکتا گیہوں کا پودا تیّار ہونے کے لئے ضرورت ہے کہ زمین کا اُوپری حصّہ ٹوٹ پھوٹ کر نرم

مٹی کی شکل میں تبدیل ہوجائے سائنس کا ہر طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ ٹھوس چٹان ویدرنگ (W EAtHERiNG) اور ڈینوڈیشن (DENUDATiON) کے بغیر نرم مٹی کی شکل اختیار نہیں کرسکتی لیکن یہ بھی معلوم ہے کہ اس توڑ پھوڑ کے کام میں کتنے عوامل مثلاً گرمی سردی بہتا ہوا پانی ہوا وغیرہ مل کر کام کرتے ہیں تب کہیں زمین کی سطح پر نرم مٹی کے میدان بنتے ہیں جہاں گیہوں کی فصل لہلہاتی ہے لیکن گیہوں کے اُگنے کیلئے صرف مٹی ہی تو کافی نہیں ہے اس کو نمی کی بھی ضرورت ہوتی ہے ——

چنانچہ ہماری زمین کا ۷۱ فیصد حصّہ پانی سے ڈھکا ہوا ہے۔ پانی کے چھوٹے چھوٹے ذخیروں کے علاوہ بحر اٹلانٹک (AtLANtiC OCEAN) بحر پیسفک (PACEFiC OCEAN) اور بحر ہند (iNDiAN OCEAN) تین بڑے ذخیرے موجود ہیں۔ یہ سمندر اتنے گہرے ہیں کہ ساری خشکی کا علاقہ اس میں ڈبویا جا سکتا ہے۔ پیسفک تو اتنا گہرا ہے کہ اس میں ہمالیہ کا پہاڑ ڈبو یا جائے تو اس کی سب سے اُونچی چوٹی ایورسٹ (EVEREST) جس کی اُونچائی ۸۸۴۸ میٹر ہے پانی میں بالکل غائب ہوجائے لیکن گیہوں کی فصل تیاّر ہونے کے لئے اصل مسئلہ پانی کی موجودگی نہیں ہے بلکہ پانی کا ان ذخیروں سے نکل کر ہمارے کھیتوں تک پہنچنا ہے چنانچہ سورج کی کرنوں میں یہ صلاحیّت رکھ دی کہ وہ سمندر کے پانی کو خاموش طریقہ سے بھاپ میں تبدیل کرتا رہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح ہوا نے اربوں ٹن پانی اپنے کندھوں پر اُٹھایا ہُوا ہے۔

لیکن اصل مسئلہ اب بھی حل طلب ہی ہے کہ پانی سے لدی ہوئی ہوا ہمارے کھیتوں تک کیسے پہنچے —؟ ہوا کے چلنے کے لئے زمین کی سطح پر ہوا کے کم دباؤ (LOW PRESSURE) اور ہوا کے زیادہ دباؤ (HiGH PRESSURE) والے خطّوں کا بننا ضروری ہے چنانچہ مطلوبہ دباؤ پیدا کرنے کے لئے ہماری زمین اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے گھوم رہی ہے۔ اس گھماؤ کی وجہ سے مطلوبہ دباؤ تو ضرور پیدا ہوگیا لیکن ساتھ

ایک دوسرا خطرہ بھی پیدا ہوگیا کہ زمین کی تیز رفتاری کی وجہ سے کہیں انسان اُلٹ پلٹ نہ ہوجائے۔ چنانچہ زمین کی سطح پر بڑے بڑے پہاڑ ہمالیہ راکیز، اینڈیز آور آلپس کی شکل میں نصب کر دیئے گئے تاکہ زمین میں توازن قائم ہوجائے۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو سائنس میں (ISOSTASY) کہتے ہیں ——

اتنی قوتیں تو مٹی اور پانی مہیا کرنے پر لگی ہوئی ہیں۔ ابھی گیہوں کی فصل تیار ہونے تک بہت سے مراحل باقی ہیں اُس کو آکسیجن (OXYGEN) نائٹروجن (NITROGON) کاربن ڈائی آکسائیڈ (CARBON DIOXIDE) وغیرہ گیسوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے اس کو بہت سی معدنیات چاہیئے۔ یہ پودا مستقل دھوپ برداشت کرسکتا ہے اور نہ مستقلاً اندھیرے میں زندہ رہ سکتا ہے، اسی لئے رات اور دن کا نظام بنایا گیا تاکہ دن میں روشنی اور گرمی رہے اور رات میں خنکی حاصل کرتا رہے۔

ہمارے خالق نے جب ایک دانہ گیہوں تیار کرنے میں اتنی قوتیں ہماری خدمت پر لگا رکھی ہیں تو ہماری لمبی چوڑی ضروریات کی فراہمی پر کتنی قوتیں لگی ہوئی ہوں گی ——

نظامِ کائنات میں

شہد کی مکھّی کس طرح کام کرتی ہے

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ۝ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (۱۶ : ۶۸-۶۹)

تیرے ربّ نے شہد کی مکھّی کو وحی کے ذریعے فطری تعلیم دے رکھی ہے کہ وہ پہاڑوں میں درختوں میں اور جن مقامات سے اس نے اپنی تگ و دو کو کنٹرول کرنا ہے، اپنا چھتّہ بنائے، پھر ہر طرح کے پھولوں اور پھلوں سے رس چوستی پھرے اور نہایت فرماں پذیری اور اطاعت گزاری سے اس راستہ پر چلتی جائے جو خدا کے قانونِ فطری نے اس کے لئے تجویز کیا ہے۔ چنانچہ جب وہ قانونِ فطرت کا یوں اتباع کرتی ہے تو اس کے اندر سے مختلف رنگوں کا رس (شہد) نکلتا ہے جس میں لوگوں کے لئے (غذائیت کے علاوہ) شفا بھی ہوتی ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے معرفت تک پہنچنے کی نشانی ہے جو فکر و تدبّر سے کام لیں۔"

قرآنِ کریم کے اس خوشنما بیان کی وضاحت کی جاتی ہے جس میں آپ دیکھیں گے کہ مکھیوں کے نظام میں کس طرح ہر ایک مکھی جو کام اس کے سپرد ہے حسن و خوبی سے سرانجام دیتی ہے اور پھر تمام مکھیاں اپنی محنت کے ماحصل کو اپنے مشترکہ بیت المال میں جمع کر دیتی ہیں اور وہاں سے ہر ایک کو اپنی ضرورت کے مطابق سامانِ نشوونما ملتا رہتا ہے۔ اور کس طرح ہر موسم کے مطابق معیشت کو کنٹرول کیا جاتا ہے اور ملکہ مکھی صرف اتنے انڈے دیتی ہے جس قدر کہ ورکرز کی ضرورت ہو اور کس حسن و خوبی سے ورکرز کے اندر لیبر کی تقسیم ہوتی ہے اور کس طرح سردی کے موسم میں نر مکھے جو بیکار ہوتے ہیں، ان کو سوسائٹی سے باہر نکال دیا جاتا ہے ——

شہد کی مکھی کی تنظیم

شہد کی مکھی قدرتی طور پر درختوں پر اور پہاڑوں کی خالی جگہوں میں اپنے چھتے بناتی ہے۔ گو اب انسان نے خود ان کو پالنا شروع کر دیا ہے۔ چھتے کے اندر (VERTICLE) عمودی کوٹھڑیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن بعض کوٹھڑیاں (LATERAL) یا بغلی بھی ہوتی ہیں جو کہ شہد اور زیرہ جمع کرنے کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔ زیرہ یا پھل پھول کا بور یا سفوف مکھیوں کی خوراک ہے۔ جو وہ پھولوں سے جمع کرتی ہیں اور یہ چھتے کی تمیز بھی حیران کن ہے کہ شہد ایک عمودی کوٹھڑی میں نہیں رکھا جا سکتا۔ چنانچہ اس کے ذخیرے کے لئے بغلی کوٹھڑیاں بنائی جاتی ہیں ——

شہد کے عام چھتے کے اندر قریباً ۶۵۰۰۰ مکھیاں آباد ہوتی ہیں۔ جس کے تین درجات ہیں۔ ان میں صرف ایک ملکہ ہوتی ہے۔ جو اس کالونی میں آباد تمام مکھیوں کی ماں ہے۔ چند ہزار نر مکھے (POLLEN) ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ باقی تمام کارکن مکھیاں بڑی تعداد میں ہوتی ہیں۔ ملکہ اور نر مکھے اولاد پیدا کرنے کے قابل ہوتے ہیں ملکہ انڈے دیتی ہے اور نر مکھے جو نئی ملکہ پیدا ہوتی ہیں ان کو بار آور کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ چھتے کا

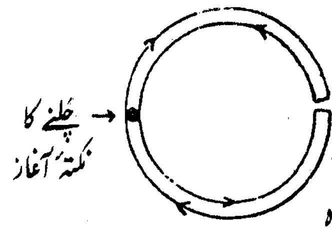
تمام کام اور باہر اندر کی تگ و دو کارکن مکھیاں کے ذمّے ہوتی ہے جو پیدائش کے لحاظ مادہ ہوتی ہیں لیکن آگے اولاد پیدا کرنے والے اعضاء ان میں موجود نہیں ہوتے یا ان کے صرف باقیات ہوتے ہیں، اس لئے وہ انڈے نہیں دیتیں اور تمام دن پانی فراہم کرنے پھولوں کا رس اور (POLLEN) زیرہ اکٹھا کرنے، موم پیدا کرنے، چھتہ تعمیر کرنے، تمام درجات کے لئے خوراک مہیّا کرنے، ملکہ کی خدمت کرنے، انڈوں سے نکلنے والے نئے بچّوں کو پالنے، چھتے کو صاف ستھرا رکھتے اور باہر سے دشمن کی جارحیّت کا مقابلہ کرنے میں مصروف رہتی ہیں۔ وہ درختوں کی کونپلوں سے (RESIN) رال گوند سمیٹ کر لاتی ہیں اور چھتے میں جو درزیں موجود ہوتی ہیں ان کو اس کے ذریعے بند کرتی ہیں تاکہ پانی یا ہوا اندر داخل نہ ہو سکے، قدرت نے ان کے اندر ڈنک رکھ دیئے ہیں تاکہ وہ چھتّے کی حفاظت کر سکیں اور شہد کو دوسرے حیوانات کی چوری سے بچا سکیں ــــــ

جب موسم بہار میں موسم گرم ہونا شروع ہوتا ہے اور پھول نکلنے شروع ہوتے ہیں ہیں تو کارکن مکھیاں پھولوں کا رس اور زیرہ اکٹھا کرتی ہیں ملکہ تیزی کے ساتھ انڈے دینا شروع کرتی ہے اور انڈوں سے نکلنے والے بچّوں سے چھتّے کی آبادی بے حد بڑھ جاتی ہے آبادی بڑھ جانے سے مکھیّاں غول کی شکل میں چھتّے سے اُڑ جاتی ہیں جس کے لئے ــــــ (SWARMING) کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے، ملکہ، بمعہ چند ہزار مکھیاں ایک غول کی شکل میں اُڑ کر یا تو عارضی طور پر کسی درخت پر جا بیٹھتی ہیں یا کسی نئی جگہ پر جا کر آباد ہو جاتی ہیں جن کا سروے پہلے سکاؤٹ کارکن مکھیاں کر چکی ہوتی ہیں۔ پرانے چھتّے میں جو کارکن مکھیاں باقی رہ جاتی ہیں وہ پہلی اُڑ جانے والی ملکہ کے انڈوں کی حفاظت کرتی ہیں جن سے نئی ملکہ پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں سے جو ملکہ سب سے پہلے پیدا ہوتی ہے، وہ باقی تمام انڈوں بچّوں کو اپنے ڈنگ سے ضائع کر دیتی ہیں۔ اگر بیک وقت دو نئی ملکہ پیدا ہو جائیں تو دونوں کی آپس میں لڑائی ہوتی ہے حتیٰ کہ ایک ماری جاتی ہے اور دوسری فاتح ہو کر نئی جماعت کو

کنٹرول کرتی ہے ـــــ نئی ملکہ کی پیدائش سے تقریباً ایک ہفتہ بعد ایک نر مکھا ـــ (DRONE) ملکہ کو بارآور کرتا ہے۔ اور یہ عمل ہوا میں اُڑان کے دوران ہوتا ہے۔ جہاں دونوں اُڑ کر جاتے ہیں۔ نر کا عضو تولید ٹوٹ کر ملکہ کے تولید کے خانے میں رہ جاتا ہے جہاں سے کارکن مکھیاں چھتے میں واپس آنے کے بعد اسے کرید کرید کر باہر نکالتی ہیں۔ نر خلیوں کا جو ذخیرہ ملکہ کی (SPERMOTHECA) سپرموتھیکا یعنی نر خلیوں کی تھیلی میں رہ جاتا ہے وہ ان تمام انڈوں کو بارآور کرتا رہتا ہے جو کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنی پوری عمر میں دیتی ہے۔ وہ اس بارآوری کے عمل پر کنٹرول رکھتی ہے۔ جو انڈے بارآور نہیں ہوتے اُن سے نر مکھے پیدا ہوتے ہیں۔ اس قسم کی بغیر باپ کے پیدائش سوشل کیڑوں مکوڑوں میں اور دیگر حیوانات میں عام ہے۔ ملکہ کے جو انڈے بارآور ہوتے ہیں ان سے کارکن مادہ مکھیاں پیدا ہوتی ہیں جس موسم میں پھولوں میں رس پیدا ہوتا ہے اس موسم میں ملکہ قریباً ایک ہزار انڈے روزانہ دیتی ہے جو کہ چھتے کی کوٹھڑی کے فرش میں چپاں کر دیئے جاتے ہیں۔ پہلے دو دن تک تمام لاروا کو (ROYAL JELLY) رائل جیلی کھانے کے لئے ملتی ہے۔ کارکن مکھیوں کے مُنہ کے اندر غدودوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس جیلی کے اندر پھولوں اور پھلوں کا بُور شہد اور بھاری مقدار میں وٹامن موجود ہوتی ہے۔ اس کے بعد نر مکھوں اور ورکر مکھیوں کے لاروا کو صرف شہد اور (POLLEN) پھل پھول کا بُور ملتا ہے ـــــ

ـــــ لیکن وہ لاروا جن سے ملکہ مکھیاں پیدا ہوتی ہیں، اُن کو رائل جیلی بدستور ملتی رہتی ہے جس کی وجہ سے ان کی نشوونما مختلف طریقے سے ہوتی ہے اور ان کے جسم کا سائز بڑا ہوجاتا ہے ـــــ ایک اور دلچسپ چیز ملاحظہ فرمائیے۔ اگر ملکہ کے انڈے دینے کی رفتار تیز ہو اور چھتے کی کوٹھڑیاں تعمیر کرنے کی رفتار سست ہو تو ملکہ کو کارکن مکھیوں کی طرف سے خوراک کم ملتی ہے، اس کے برعکس اگر انڈے دینے کی رفتار سُست ہو اور چھتے کی کوٹھڑیاں زیادہ بن جائیں تو ملکہ خوراک زیادہ ملتی ہے ـــــ

خوراک اکٹھی کرنے کی مہم پر کارکن مکھیاں ایسے (POLLEN) پھولوں کے بُور یا سفوف کو اکٹھا کرتی ہیں جس کے اندر پروٹین اور (NECTAR) پھولوں کا رس زیادہ ہو۔ مکھی کی خوراک کی نالی میں ایک خاص تھیلی ہوتی ہے جس کے اندر رس کو نگل کر ڈال لیا جاتا ہے۔ ایک کارکن مکھی جب باغات میں خوراک کے موقع کو دریافت کر لیتی ہے تو وہ اپنے رس جمع کرنے والے معدہ کو بھر لیتی ہے اور واپس چھتے میں آ کر یا تو نئی مکھیوں کو کھلا دیتی ہے یا اس کو ذخیرے میں جمع کر دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ ایک ناچ کرتی ہے، جس کا مقصد اس سمت کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے۔ جہاں خوراک موجود ہے، تاکہ باقی مکھیاں اس سے آگاہ ہو جائیں۔ یہ نہ صرف خوراک کے موقع کی سمت بتاتی ہیں، بلکہ چھتے سے اس کا فاصلہ بھی ظاہر کرتی ہے۔ اس رقص میں وہ اپنے جسم کے پچھلے حصے کو (SIDE TO SIDE) ایک طرف سے دوسری طرف حرکت دیتی ہے اور ایک نیم دائرے میں چلتی ہے۔ پھر واپس اسی مقام پر آتی ہے جہاں سے چلی تھی۔ پھر اُلٹی سمت پر نیم دائرے میں چلتی ہے۔ پھر واپس لوٹتی ہے اور اپنے عمل کو دُہرائے جاتی ہے ——



مکھی خوراک کے موقع کی سمت جسم کے ایک خاص جھکاؤ سے ظاہر کرتی ہے اور اس کا چھتے سے فاصلہ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکھی ایک مقررہ وقت میں کتنی مرتبہ واپس مُڑتی ہے (یا پھیرے لیتی ہے) رقص کی شدت ظاہر کرتی ہے کہ خوراک کے موقع پر کس قدر خوراک موجود ہے اور خوراک کی نوعیت کیا ہے وہ اس کے جسم کی بُو سے ظاہر ہوتی ہے۔ جو پھول پر بیٹھتے وقت اس کے جسم کو چھوتی ہے یا اس رس سے معلوم ہوتی ہے جو وہ اپنے ساتھ لاتی ہے۔ شہد والے معدے میں جو رس موجود ہوتا ہے اس پر اس کے مُنہ کے لعاب میں سے (ENZYMES) خمیر اثر انداز ہوتے ہیں چنانچہ گنّے کا رس ہو تو وہ (DEXTROSE) ڈیکسٹروس اور (LEVULOSE)

لیوولوس میں بدل جاتا ہے۔ (یہ میٹھے کی قسمیں ہیں) چھتے میں پہنچنے کے بعد مکھی اس رس کو اپنے معدے سے ایک کوٹھڑی کے اندر اُلٹ دیتی ہے، جہاں سے دیگر مکھیاں اسے اپنے مُنہ میں ڈال کر اس میں دیگر کیمیائی تبدیلیاں لاتی ہیں۔ وہ اپنے پَروں کو حرکت دے کر اس کا فالتو پانی خشک کرتی ہیں وقتاً فوقتاً وہ اُسے چکھ کر دیکھتی ہیں اور جب اس کا قوام درست ہوجائے تو اُسے ایک کوٹھڑی میں ڈال کر اس کا مُنہ موم سے بند کر دیتی ہیں ــــــ

سمت دریافت کرنے کی قوّت

(POWER OF ORIENTATION)

شہد کی مکھیوں اور دوسرے سوشل کیڑوں کی سمت دریافت کرنے کی قوّت حیرت انگیز ہوتی ہے۔ اس بات کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ خوراک جمع کرنے کی مہم میں شہد کی مکھّی سورج کی روشنی کی شعاع کے ذریعے راستہ دریافت کرتی ہے۔ وہ سورج کی شعاع کے ذریعے اپنے چھتے کی سمت کا حساب رکھتی ہے اور کسی بھی طرف سے چھتے کی طرف واپس آنے کا صحیح اندازہ رکھتی ہے ــــــ

سردی کے موسم میں مکھیاں سردی سے بچاؤ کی خاطر تھوڑی جگہ میں ایک دوسرے کے قریب سمٹ جاتی ہیں۔ اگر چھتّے میں دُھواں آجائے تو وہ شہد کے ذخیرے کی طرف دَوڑتی ہیں اور اسے اپنے پیٹ میں بھر لیتی ہیں، خوراک کی کمی سے بچاؤ کی خاطر موسم سرما کے آغاز میں نر مکھّوں کو چھتّے سے نکال دیا جاتا ہے۔ یہ تمام حرکات ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مکھّی کے اندر (INTELLECT) دانائی موجود ہے، لیکن دراصل ایسا نہیں ہے۔ یہ تمام اعمال جبلی طور پر سرزد ہوتے ہیں جسے قرآن وحی کہتا ہے ــ

(مظاہرِ فطرت اور قرآن)

اللہ سے اِتنی دُوری کیوں؟

اللہ تعالیٰ ہم سے جتنا زیادہ قریب ہے بدعملی کی وجہ سے ہم اُس سے زیادہ دُور ہوتے جا رہے ہیں۔ جناب صدرالدین شیرازی فرماتے ہیں:۔۔۔۔

"تمام چیزوں کے مقابلے میں ظاہر ہے کہ جو چیز سب سے زیادہ ہم سے قریب تر ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، یعنی ہماری ذاتوں سے جتنا قُرب خدا کی ذات کو ہے۔ دوسری کسی چیز کو اتنی نزدیکی کی نسبت حاصل نہیں ہے۔ حق تعالیٰ نے ہم لوگوں کو اسی لئے پیدا فرمایا اور اسی لئے ہماری ہدایت فرمائی کہ ہم اس کی معرفت حاصل کریں اور اچھے بندوں کے اعزاز و اکرام کا جو مقام اس نے مقرّر فرمایا ہے۔ وہ مقام ہم بھی حاصل کر سکیں تاکہ حضرتِ الٰہی کا تقرّب ہمیں میسّر آئے۔ اسی مقصد کے لئے پیغمبروں کو مبعوث کیا گیا اور کتابیں آسمان سے نازل ہوئیں۔ یعنی حق تعالیٰ کی طرف سے یہ سارا نظام اس لئے قائم نہیں کیا گیا کہ جو چیزیں خدا سے دُور اور بعید ہیں ان سب کے مقابلے میں ہم ہی سب سے دُور ہو جائیں اور جتنے بدبخت نفوس حیرت و شک کے میدان میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اُن کے مقابلے میں ہم ہی سب سے زیادہ بدبخت قرار پائیں۔۔۔۔

(اسفارِ اربعہ)

وُجودِ باری تعالیٰ کی تشکیکات کا جواب

سر طاس جو فلسفہ الٰہیات کے مشہور متکلّم ہیں، وجود باری تعالیٰ کے اثبات میں ایسے دلائل پیش کرتے ہیں کہ اگر انہیں بصیرت کے ساتھ سمجھ لیا جائے تو دہریّت

اور شرکیہ تشکیکات ہمیشہ کے لئے دفن ہو جاتی ہیں ۔ آپ لکھتے ہیں :۔

خُدا کے وجود کا اثبات پانچ طریقوں سے کیا جا سکتا ہے ،

۱ ۔ پہلی اور واضح تر دلیل حرکت کی بنیاد پر پیش کی جا سکتی ہے ۔ یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ بعض چیزیں متحرّک ہیں اور یہ حرکت کسی اور وجود کے باعث ظاہر ہوتی ہے ۔ حرکت کا عمل اسی بالقوّۃ صلاحیّت کو بالفعل شکل میں تبدیل کر دینے کا نام ہے لیکن کسی شے کا بالقوۃ حالت میں تبدیل ہونا تبھی ممکن ہے کہ کوئی دوسری شے بالفعل حالت میں اس سے پہلے موجود ہو ، مثلاً آگ جو بالفعل گرم ہے لکڑی کو جو بالقوۃ گرم نہیں ہے گرم کر دیتی ہے اور اس طرح بالقوہ حالت بالفعل حالت میں تبدیل ہو جاتی ہے[۱] ۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک ہی نقطۂ نگاہ سے ایک وقت میں ایک شے بالفعل بھی ہو اور بالقوہ بھی ۔ اگرچہ مختلف زاویوں سے یہ ممکن ہو سکتا ہے ۔ وہ شے جو بالفعل گرم ہے اُسی وقت بالقوہ گرم نہیں ہو سکتی ، لیکن ہم اسے بالقوہ سرد کہہ سکتے ہیں ۔ اسی طرح یہ ممکن ہے کہ ایک ہی طریقے سے ایک شے متحرک بھی ہو ، محرک بھی ہو ۔ یعنی وہ خود اپنی حرکت کا باعث بھی ہو ۔ پس اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ جو شے بھی متحرّک ہے وہ کسی دوسری شے کے زیرِ اثر حرکت میں ہے ۔ اگر محرّک خود متحرّک ہے تو لازمی طور پر اس کی حرکت

---

[۱] فعلیت کا لفظ قوّت کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے ۔ قوّت سے مُراد کسی شے کی صلاحیّت اور استعداد ہوتی ہے ۔ مثلاً تخم میں درخت بن جانے کی قوّت ہے ۔ یعنی اس کی صلاحیّت پائی جاتی ہے کہ وہ درخت بن جائے ۔ اسی طرح تخم جب درخت کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس کی قوّت نے فعلیت کا رنگ اختیار کر لیا ۔

کسی اور وجود کے باعث ہے اور علیٰ ھذا القیاس یہ سلسلہ لامتناہی نہیں ہو سکتا کیونکہ کوئی محرکِ اولیٰ نہیں ہوگا اور محرک بھی نہیں ہوگا۔ جیسا کہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ بعد کے محرک اسی صورت میں متحرک ہوتے ہیں جب پہلا محرّک انہیں حرکت میں لاتا ہے، مثلاً چھڑی اُس وقت حرکت کرتی ہے جب ہاتھ اُسے متحرک کرتا ہے۔ اسی طرح ہم محرّکِ اوّل تک جا پہنچتے ہیں جسے کسی دوسرے نے متحرک نہیں کیا اور یہی خدا ہے[1] ——

۲ —— دوسری دلیل علّتِ فاعلی کی بُنیاد پر قائم کی گئی ہے محسوسات کی دُنیا میں علّتِ فاعلی کی ایک ترتیب ہے۔ دُنیا میں کوئی ایسی شے موجود نہیں (اور نہ ممکن ہے جو خود اپنے وجود کی علّتِ فاعلی ہو، اگر ایسا ہو تو وہ اپنے آپ سے مقدّم ہوگی جو ناممکن ہے عللِ فاعلی کا سلسلہ لامتناہی نہیں ہو سکتا، کیوں کہ اس سلسلہ میں پہلا وسطیٰ علّت کی علّت ہوتا ہے اور وسطیٰ، آخری کی علّت، خواہ وسطیٰ علت کثیر ہو یا واحد، اگر علّت نہ ہو تو معلول بھی غائب ہوگا۔ پس اگر عللِ فاعلی کے سلسلے میں پہلی علّت موجود نہیں تو نہ کوئی وسطیٰ علّت ہوگی اور نہ آخری۔ اگر لامتناہی سلسلہ ممکن ہو تو نہ کوئی پہلی علّتِ فاعلی ہوگی اور نہ عللِ وسطیٰ اور اسی طرح آخری معلول بھی نہ ہوگا۔ اور یہ سب بظاہر بے معنی ہے اس لیے ہم مجبور ہیں کہ کسی پہلی علّتِ فاعلی کو تسلیم کریں

[1] اس کی مختصر تفہیم یہ ہے کہ ہم اشیاء کو متحرک دیکھتے ہیں۔ کوئی شے خود بخود متحرّک نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی حرکت کا اصل سبب کوئی خارجی قوت ہے اگر وہ دوسری شے خود متحرک ہے تو اس کی حرکت کی علّت کوئی تیسری شے ہوگی جو اِن دونوں سے مختلف ہوگی —— تحریک کا یہ سلسلہ لامتناعی نہیں ہو سکتا۔ کوئی محرّکِ اوّل ضرور ہوگا جو اپنی ذات میں غیر متحرک ہے اور وہی اس دُنیا کی ہر حرکت کی علّتِ اُولیٰ ہے اس کے بغیر حرکت کا وجود ممکن ہی نہیں چونکہ ہم ہر جگہ دیکھتے ہیں۔ اس لیے ایک محرّکِ اُولیٰ کا وجود ناگزیر ہے —— اور یہی خُدا ہے ——

اور یہی خدا ہے ـــــ

۳ ـــــ تیسری دلیل امکان ہے اور وجوب سے تعلّق رکھتی ہے۔ محسوسیات کی دُنیا کی ہر شے موجود بھی ہے اور معدوم بھی۔ ہر شے پیدا ہوتی ہے اور پھر درجۂ تکمیل تک پہنچ کر زوال پذیر ہوجاتی ہے اور اسی طرح معدوم ہوجاتی ہے۔ اس کا ہمیشہ موجود رہنا ناممکن ہے کیونکہ وہ شے جو ایک معدوم ہوجاتی ہے ضرور اپنے موجود ہونے سے پہلے بھی معدوم ہوگی، پس جب شے معدوم ہوسکتی ہے تو پھر ممکن ہے کہ ایک ایسا وقت بھی ہو جب کوئی چیز موجود نہ ہو ـــــ

اگر یہ صحیح ہے تو پھر اُس وقت بھی کوئی شے موجود نہ ہوگی۔ کیونکہ جو چیز معدوم ہے وہ صرف ایک موجود شے کے باعث موجود ہوسکتی ہے۔ پس اگر کسی وقت کوئی شے موجود نہ تھی تو کسی شے کا وجود میں آنا ناممکن ہوجاتا ہے۔ اور اُس کی رُو سے آج بھی کوئی شے موجود نہیں ہوگی، جو ظاہراً لایعنی ہے۔ اس لئے ہر چیز ناممکن الوجود نہیں۔ ایسا کوئی وجود ضرور ہے جو اپنی ذات سے واجب ہے۔ ہر واجب شے کا وجوب یا تو کسی غیر کے باعث ہے یا اپنی ذات کے باعث ـــــ

اگر وجوب کی علّت کوئی دوسری شے ہے تو یہ سلسلہ لامتناہی نہیں ہوسکتا پس ہم کسی ایسے وجود کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں جس کا وجوب اس کی اپنی ذات کے باعث ہے، جو واجب الوجود ہے اور یہی خدا ہے ـــــ

۴ ـــــ چوتھی دلیل اشیاء کے مراتبِ وجود پر مبنی ہے۔ ہم عام طور پر کہتے ہیں کہ یہ آدمی کم یا زیادہ نیک، شریف، رحم دل ہے۔ "کم" اور "زیادہ" کا استعمال کسی نہ کسی معیار کو سامنے رکھ کر ہی کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ یہ شے بہت گرم ہے تو ہمارے نزدیک "گرم ترین" کا تصور پہلے موجود ہوتا ہے۔ اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کوئی شے ضرور ہے جس میں نیکی، شرافت اور رحم دلی، ایک نصب العین

حالت میں پائی جاتی ہے، چنانچہ یہ شے بہترین وجود کی بھی حامل ہو گی، کیونکہ جہاں صفات کی انتہائی بلندی ہو گی، وہاں موجود کی صفت کا پایا جانا ناگزیر ہے۔ جو شے کسی جنس میں سب سے زیادہ مکمل شکل میں موجود ہو گی وہ اس جنس کی ہر شے کی علّت ہو گی۔ مثلاً آگ جو گرمی کی کامل ترین شکل ہے۔ ہر جگہ گرمی کی علّت ہے۔ اس طرح اس کائنات کی ہر شے کے وجود اور کمال کی کوئی نہ کوئی علّت ضرور ہے اور اس کو ہم خدا کہتے ہیں —

۵ — پانچویں دلیل اس دُنیا کے نظام پر مبنی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مادّی اشیا جو عقل و نطق سے عاری ہیں کسی مقصد کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا چلن تقریباً یکساں ہوتا ہے، اس لئے ہم ان سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کی تخلیق ہی اس لئے ہوئی کہ اس طرح اُن سے استفادہ کیا جائے، ہر مادّی شے جو عقل سے عاری ہے اس سے فائدہ وہ شخص اُٹھا سکتا ہے جو عقل و فہم سے آراستہ ہے۔ مثلاً تیر صرف تیر اندازی کے لئے فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کوئی ذات ایسی حکیم اور ایسی علیم ضرور ہے جس نے کائنات کو ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کیا اور اس ذات کو ہم خدا کہتے ہیں۔

(فلسفۂ مذہب ص۱۱۱)

خُدا کا بگڑا ہُوا تصوّر!

باطل مذاہب میں خُدا کا جو بگڑا ہُوا تصوّر پایا جاتا ہے، وہ انسان کی طلب کا مکمّل جواب نہیں بنتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی نفسیّات ایک کامل خُدا کی طالب ہے۔ اور یہ مذاہب اس کو ناقص خُدا کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ اِن بنار پر اگرچہ ایسا ہوتا ہے کہ اندرُونی طلب سے مجبُور ہو کر بہت سے لوگ اس کی طرف لپک پڑتے ہیں، مگر اُن کی حقیقی رُوحانی تسکین اُسی خدا سے ہو سکتی ہے جس کا تصوّر اسلام نے پیش کیا ہے۔ ایک شخص اپنی سواری کے لئے موٹر کار کا طالب ہو تو آپ اُس کو کھلونا گاڑی دے کر مطمئن نہیں کر سکتے، اس کا اطمینان تو اُسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ اُس کو ایک اصلی کار مِل جائے، اسی لئے قرآنِ حکیم میں کہا گیا ہے: "الا بذکر اللہ تطمئن القلوب" —

"سُنو! خدا کی یاد ہی سے دِلوں کو اطمینان ہوتا ہے"۔

خُدا اگرچہ ہمارے سامنے نہیں ہے، مگر اس کی تخلیق ایک عظیم کائنات کی صورت میں ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ ہم اس کو دیکھتے ہیں اور اِس کا تجربہ کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں انسان کا ذہن کسی ایسے خدا پر ہی مطمئن ہو سکتا ہے جو موجودہ کائنات کے شایانِ شان ہو۔ جو آدمی کو واقعی اس عظیم کائنات کا خالق دکھائی دے۔ اس سے کم تر درجہ کا خدا، انسان کے ذہن کو اپیل نہیں کر سکتا۔

ایک امریکی سائنس دان والٹر آسکر لنڈبرگ نے اس کی ایک دلچسپ مثال دی ہے : وہ لکھتے ہیں :—

" ایک سائنس دان دوسروں کے مقابلہ میں ایک خصوصی توقع اِس بات کی رکھتا ہے کہ وہ خدا کی سچّائی کو سمجھ سکے ، وہ اساسی اصول جس پر اُس کے کام کی بُنیاد ہے وہ دراصل خدا کے وجود کا ایک اظہار ہے " اس کے باوجود سائنس کی تعلیم کے بعد کیوں لوگ خدا کے منکر ہوجاتے ہیں —"

امریکی پروفیسر کے نزدیک دو میں سے ایک خاص سبب اسکا یہ ہے منظّم مسیحت میں نوجوانوں کے اندر گہرائی کے ساتھ ایک ایسے خدا کا عقیدہ پیوست ہے جو انسانی صورت میں پیدا ہُوا۔ اس طرح کے ذہن بعد میں جب سائنس کی تعلیم حاصل کرتے ہیں تو خدا کا یہ اُلٹا اور محدود تصوّر دِھیرے دِھیرے غیر عقلی اور غیر علمی معلوم ہونے لگتا ہے، بالآخر جب مطابقت پیدا کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہوجاتی ہیں تو اس کے بعد خدا کا یہ تصوّر مکمّل طور پر چھوڑ دیا جاتا ہے —

(اسلام اور عصرِ حاضر صہ ۱۱۹ از مولانا وحید الدین خان)

مادّی تمدّن کی شکست اور خُدا کی ضرورت

تاریخ انسانی کے مشہور عالمی مؤرخ ٹائن بی تہذیبِ حاضر کی ناکامی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :—

" عصرِ جدید کے انسان کا حال اُس ہارے ہوئے جُواری کی طرح ہے جس نے

(فتح حاصل کرنے کے لئے) اپنے تمام داؤ پیچ قمار بازی میں لگا دیئے ہوں۔ یہاں تک کہ تمام دولت اور اپنی زندگی کی بازی بھی لگا دی ہو تاکہ وہ کامیابی حاصل کر سکے۔ مگر اس کے باوجود اُسے اپنی تدابیر (کے کامیاب ہونے پر) بھروسہ اور اعتماد نہیں ہے۔ تاریخ عالم کے مکمل مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دُنیاوی کامیابی انجام کار سب سے بڑی ناکامی بنتی ہے، قوموں کی تہذیب و تمدّن کو صرف اُسی وقت صحیح اور مکمّل کہا جا سکتا ہے، جب تک اس میں تحقیق کی صلاحیّت باقی رہتی ہے ——

صنعتی انقلاب کے دَور میں سائنس کی ترقی نے اُس زمانے کے حالات کے مطابق بڑا تخلیقی کارنامہ انجام دیا ہے اور اپنے زمانے کے تقاضوں اور ضروریات کی کافی تکمیل کی ہے مگر سوال یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جو مسائل ہمیں درپیش ہیں سائنس کی تجربہ گاہوں کے ذریعے ان کو حل کیا جا سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب یقیناً نفی میں ہے کیونکہ ہمارے موجودہ مسائل اخلاقی نوعیت کے ہیں جنہیں سائنس قطعاً حل نہیں کر سکتی بلکہ دیگر مادّی تدابیر سے بھی انہیں حل کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں اور خدا کے تصوّر کے بغیر معاشی اور سماجی اغراض کا علاج کرنے کے نقصانات ہم پر اچھی طرح واضح ہو چکے ہیں۔ اس لئے دورِ حاضر کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایک مافوق الفطرت ہستی (خدائے بزرگ و برتر) پر ایمان لانے کے جذبے کو دوبارہ زندہ کیا جائے ——

(موجودہ انسان کو تاریخ کی تنبیہ ص— از ٹائن بی)

مادّہ کے قدیم ہونے کا رد اور خدا کا ثبوت

جناب محمد زکی کامل اکبرآبادی لکھتے ہیں :—

فلاسفۂ قدیم و خطاب کو قدامت کے مادّہ کے سر زبردستی منڈھتے ہیں—

ذٰلک قولھم بافواھھم مادّہ صورِ نوعیہ یا صورِ جسمیہ کے مقابل ایک شئے ناقص ہے، صورِ نوعیہ یا جسمیہ سے بیشتر مادّہ کی ضرور کوئی صورت تھی جو صورِ نوعیہ و جسمیہ پر پہنچنے کے بعد جاتی رہی اور تصریحی تغیّر ہے اور جو متغیّر ہے لازماً وہ حادث ہے ہر مرکب متغیّر ہوتا ہے۔ پس مادّہ بھی جو اجزاء سے مرکب ہے متغیّر ثابت ہوا، اور جو متغیّر ہے وہ حادث ہے، سائنس دان کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے مادّہ ہے اور اُس کی حرکت ہے اور کچھ بھی نہیں۔ تو لامحالہ مادّہ یا فاعل ہوگا یا منفعل۔ اور حرکت بھی—

مگر مادّہ کو فلاسفہ قدیم و جدید دونوں منفعل مانتے ہیں۔ پھر اُس کا فاعل کون ہوگا؟ حرکت کو فاعل نہیں کہہ سکتے کیوں کہ وہ تو ایک عرض ہے جو اپنے (مادّے کے) ساتھ قائم ہے اور خود ہی مفعول اور سراسر علم ہے۔ پس بالضرور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مادّہ کا فاعل کوئی اور ہے اور وہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی حقیقت اور ماہیّت ایسی کامل واقفیّت رکھتا ہے جو بجز صانع اور کسی کو نہیں ہو سکتی—

یورپ کا مشہور و معروف فلاسفر نیوٹن لکھتا ہے کہ کواکب کی حرکاتِ جاریہ ممکن نہیں کہ محض عام قوّتِ جاذبہ (گریوٹی) کے فعل کا نتیجہ ہوں۔ یہ قوّتِ جاذبہ

تو کواکب کو سورج کی سمت دھکیلتی ہے، اس لئے کواکب کو سورج کے گرد حرکت دینے والا ضروری ہے کہ کوئی خدائی ہاتھ ہو، جو باوجود قوّتِ جاذبہ کی عام کشش کے ان کو اپنے مداروں پر قائم رکھ سکے، کوئی سببِ طبعی ایسا نہیں بتلایا جا سکتا ہے جس نے تمام کواکب کو کھلی فضا میں جکڑ رکھا ہے کہ وہ سب سورج کے گرد چکّر لگاتے وقت ہمیشہ معیّن مداروں پر اور ایک خاص جہت میں حرکت کیا کریں۔ جس میں کبھی تخلّف نہ ہو، پھر کواکب کی حرکات اور سرعتِ رفتار میں ان کی اور سورج کی درمیانی مسافت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو دقیق تناسب اور عمیق توازن رکھا گیا ہے، کوئی سببِ طبعی نہیں ہو سکتا، جس سے ہم ان منظّم اور محفوظ نوامیس (قاعدوں قانون) کو وابستہ کر سکیں، ناچار اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ سارا نظام کسی ایسے زبردست حکیم و علیم کے ماتحت ہے جو ان تمام اجرامِ سماوی کے مواد اور اُن کے خواص سے پورا پورا واقف ہے اور ان پر پوری طرح قادر ہے اور اس کی قدرت اس سارے نظامِ عالم کی مشینری چلا رہی ہے ——

(صداقتِ اسلام ص۹)

تضاد کے قانون سے

آخرت کا اثبات

قرآن میں ہے :

(ہم نے ہر چیز کو جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے) —— آج سائنس اس حقیقت کو تسلیم کر چکی ہے۔ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ ہر چیز اپنا ایک ضد (Anti) رکھتی ہے خود اس کا وجود اسی اینٹی کے بغیر ناممکن ہے ——

۱۹۳۲ء میں (K.ANDR SON) نے کاسمک ریز (COSMIC(RAYS) کے اندر (Anti ELECtRON) (الیکٹران کی ضد) کا پتہ لگالیا اور اس کا نام پازیٹران (POSitRON) رکھا۔ یہ پہلا انٹی پارٹکل (Anti PARtiCLE) بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح اینٹی پارٹکل کو تسلیم کرتے ہی فطرتاً سائنسدانوں کی توجہ اینٹی نیوکلیس (A nti NCLEUS) اور اینٹی ایٹم کی طرف مڑ گئی۔ ۱۹۳۳ء میں ڈیراک (DiRAC) نے اپنی ایک تقریر میں اینٹی ورلڈ (Anti WORLD) کے امکان کا ذکر کیا تھا۔ اور اس طرح اینٹی میٹر (A nti MAttER) اور اینٹی ورلڈ کی بات چل پڑی۔ چونکہ ہر چیز اپنا ایک اینٹی (ضد) رکھتی ہے۔ اس لئے دنیا کا بھی ایک اینٹی (ضد) ہونا چاہیئے۔ آج

سائنسدانوں کا خیال ہے کہ اینٹی وَرلڈ (Anti WORLD) ہماری دُنیا کے متوازی، ایک حقیقی وجود رکھتی ہے۔ اور ڈیراک (DiRAC) کے نظریہ کے مطابق ایک اینٹی ورلڈ کا وجود ضروری ہے ——

ڈاکٹر نان (DR. NAAN) کا خیال ہے کہ اینٹی وَرلڈ کا بیان طبعی سائنس (PHYSiCAL SCiENCE) کے اصولوں اور بنیادوں پر نہیں کیا جا سکتا۔ ان کو یقین ہے کہ وہ دُنیا آج بھی موجود ہے۔ لیکن وہ ہم سے آزاد اور ہماری دُنیا کے متوازی اپنا وجود رکھتی ہے (J.S. HALDANE) کا کہنا ہے :——

" اس بات کے ماننے میں بھی کوئی دُشواری نہیں ہے کہ اس طبعی کائنات کے پیچھے ایک اور دُنیا ہے ——"

(PHiLOSOPHiCAL BASiS of BLOLGY PAGE 38)

(MAXPLANK) نے اپنی کتاب :

(UNiVERS IN THE LiGHt OF MODERN PHYSiCS)

میں لکھا ہے :-

" اس مشاہدہ کی دُنیا کے علاوہ ایک حقیقی دُنیا بھی ہے۔ جو انسان کے علم اور تصوّرات کے ماتحت نہیں ہے "

(A.S. ADDiNGtON) نے بھی اسی قسم کا خیال اپنی کتاب (WORLD- SCiENCE AND THE UNSEEN) کے صفحہ ۲۳ پر ظاہر کیا ہے ——

سائنسدانوں کے خیالات صاف بتلا رہے ہیں کہ انہوں نے نہ صرف آخرت کو تسلیم کر لیا ہے بلکہ انہیں پُورا یقین ہے کہ وہ آخرت آج بھی موجود ہے۔ وہاں کے حالات یہاں کے حالات کی ضد ہیں - یہاں کی ہر چیز عارضی ہے - اور وہاں کی ہر چیز مستقل، یہاں کی ہر چیز بے قرار (UNStEBLE) ہے جبکہ دوسری دُنیا کی ہر چیز کو اَبدی قرار (STABLA)

سائنسدانوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ممکن ہے کہ دوسری دُنیا کی روشنی ہم تک برابر پہنچ رہی ہو لیکن چونکہ دونوں روشنیوں کو ہم اَب تک الگ نہیں کر سکے۔ اس لئے وہ دوسری دُنیا ہم کو دکھلائی نہیں دیتی۔ دوسری دُنیا کے جاننے میں نیوٹرانیو (NEUtRiNO) سے مدد مِل سکتی ہے۔ لیکن نیوٹران اور اینٹی نیوٹرینو کو ایک لمحہ کے لئے بھی قرار نہیں ہے، اس لئے ان کا پکڑ لینا ذرا مشکل ہے۔ بہر حال اَب آخرت کا تصوّر کوئی غیر سائنسی (UN-SciENTiFic) تصوّر نہیں رہا ——

آخرت کا عقیدہ سارے مذاہب کا بُنیادی عقیدہ ہے۔ سائنسی دُنیا بھی اس کو تسلیم کر چکی ہے۔ پھر بھی جب انسان سوچتا ہے کہ جب آدمی مر گیا اس کا گوشت اور چمڑا سڑ گل گیا۔ کچھ پانی بن کر بہہ گیا، کچھ گیسوں میں تبدیل ہو کر ہَوا میں مِل گیا۔ ہڈی تک بوسیدہ ہو کر زمین میں مِل گئی تو وہی شخص دوبارہ مع اپنے جسم کے کیسے زندہ کیا جائے گا؟ ذہن کسی طرح اس کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ یہ آج کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر دَور میں سب سے زیادہ اُچنبھا اس نظریہ پر ہُوا ہے اور لوگوں نے صاف کہہ دیا کہ یہ تو ایک انہونی بات ہے۔ اس لئے بار بار سوال اُٹھتا ہے کہ کیا آخرت ممکن بھی ہے ؟

چنانچہ اس کے بارے میں قرآن کہتا ہے :——

"کیا ہم پہلی بار تخلیق سے عاجز تھے ؟ مگر ایک نئی تخلیق کی طرف سے یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں " (سورۃ "ق" آیت ۱۵)

جو شخص خدا کا منکر نہ ہو اور حماقت کی اس حد تک نہ پہنچ گیا ہو کہ اس منظّم کائنات اور اس کے اندر انسان کی پیدائش کو محض ایک اتّفاقی حادثہ قرار دینے لگے۔ اس کے لئے یہ ماننے بغیر چارہ نہیں ہے کہ خدا ہی نے ہمیں اور اِس پُوری کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اَب یہ اَمرِ واقعہ کہ ہم اس دُنیا میں زندہ موجود ہیں اور زمین و آسمان کا یہ سارا کارخانہ ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہا ہے آپ ہی اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ خدا ہمیں اور اس کائنات کو پیدا کرنے

سے عاجز نہ تھا۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ قیامت برپا کرنے کے بعد وہی خدا ایک دُوسرا نظامِ عالم نہ بنا سکے گا۔ اور موت کے بعد وہ ہمیں دوبارہ پیدا نہ کرسکے گا تو وہ محض ایک خلافِ عقل بات کہتا ہے۔ خدا عاجز ہوتا تو پہلے ہی پیدا نہ کرسکتا۔ جب وہ پہلے پیدا کر چکا اور اسی تخلیق کی بدولت ہم وجود میں آئے ہُوئے ہیں۔ تو یہ فرض کرلینے کے لئے آخر کیا معقول بُنیاد ہو سکتی ہے کہ اپنی ہی بنائی ہُوئی چیز کو توڑ کر پھر بنا دینے سے وہ عاجز ہو جائے گا۔ بلکہ وہ چاہے تو اس کائنات کو ہزاروں مرتبہ توڑ پھوڑ کر دوبارہ بنا سکتا ہے ـــــ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْز ـــــ

ڈارون کا نظریۂ ارتقاء

دہریّت کا بُنیادی سبب ہے؟

کارل مارکس کا خیال ہے کہ دُنیا میں نہ خدا ہے نہ رُوح۔ کائنات کی حقیقت فقط مادہ ہے جو ارتقاء کرتے کرتے انسان تک پہنچا ہے۔ انسانی مرحلہ پر پہنچنے کے بعد کائنات کے ارتقاء نے انسانی سماج کے اقتصادی یا معاشی حالات

مادّہ کا ارتقاء

ارتقاء کی صورت اختیار کی ہے، نفسِ انسانی فقط مادّہ کی ایک خاص ترکیب و ترتیب اور ایک خاص ترقی یافتہ صورت کا نام ہے۔ انسان، مادّہ کی بنی ہوئی ایک کَل ہے جس کو روٹی، کپڑا، مکان اور دوسری مادّی اشیاء کی ضرورت ہے، جب اس کی یہ ضروریات پُوری نہیں ہوتیں تو وہ ذہنی طور پر ان کی کمی پُوری کرنے کے لئے خُدا، مذہب، فلسفہ، سیاست، علم، اور ہُنر کے ڈھکوسلے یا کھلونے ایجاد کر لیتی ہے ـــــ اور جب تک اس کی معاشی ضروریات تشنہ رہتی ہیں وہ برابر ان سے اپنے آپ کو فریب دیتی اور اپنے دِل کو بہلاتی اور اپنے غم کو غلط کرتی رہتی ہے، لہذا انسان کو چاہیئے کہ اپنی زندگی کا نظام اس طرح سے بنائے کہ اس

میں اقتصادی ضروریات کی تکمیل اور تشفی کے سوائے اور کسی چیز کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اگر انسان کی زندگی میں اقتصادی ضروریات کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور رُوحانی اقدار کی گنجائش باقی رہے گی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا اس کی اقتصادی ضروریات کی تکمیل اسی نسبت سے ناقص رہیگی۔

کارل مارکس نے اپنے فلسفہ کی تائید کے لئے ڈارون کے نظریۂ ارتقاء سے کام لے کر اسے اپنے مقصد کے مطابق ڈھال لیا ہے اور اس کی مدد سے اس نے ایک نظریۂ تاریخ وضع کیا ہے جسے وہ تاریخی مادیّات کا نام دیتا ہے ــــــ

ڈارون کا نظریہ تو زندگی کی ابتداء سے لے کر صرف انسان کے ظہور تک کائنات کے ارتقاء کی کیفیّت بیان کرتا ہے لیکن انسان کے ظہور میں آنے کے بعد ارتقاء کس طرف ہو رہا ہے؟ کارل مارکس نے اپنے نظریۂ تاریخی مادیّت کے ذریعہ اس سوال کا جواب مہیّا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح سے وہ ڈارون کے نظریہ کو آگے لے گیا ہے۔ اس کے نزدیک حیاتیاتی مرحلہ کی طرح انسانی مرحلہ میں بھی ارتقاء کا سبب میکانکی قوّتوں کا عمل اور ردِّ عمل ہے۔ تاریخی مادیّات کے نظریہ کا ماحصل یہ ہے کہ کائنات ایک عالم گیر اشتراکی انقلاب کی طرف حرکت کر رہی ہے۔ مادّہ شروع سے ترقی کرتا چلا آیا ہے جب یہ ترقی کرتے کرتے انسان تک پہنچا تو اس کے ارتقا نے انسان کے نظام ہائے معاشی کو اپنا راستہ بنایا، چنانچہ اس حرکت ارتقاء کی وجہ سے انسانی سماج کے نظام ہائے معاشی بدلتے رہے ہیں ــــــ

اس تغیّر کا آخری نتیجہ یہ ہوگا کہ دُنیا میں ایک اشتراکی انقلاب رونما ہوگا جو تمام دُنیا میں پھیل جائے گا۔ تاریخی مادیّات کا تصوّر فلسفۂ اشتراکیت کو بہت مضبُوط کر دیتا ہے، کیونکہ بظاہر یہ تصوّر اس سوال کا سب سے پہلا معقول اور مدلّل جواب ہے کہ انسانی مرحلہ میں ارتقاء کا رُخ کس طرف ہے۔ اس تصوّر نے فلسفہ اشتراکیت کو اس لئے بھی بہت فروغ دیا ہے کہ اس کو ماننے کے بعد ایک شخص مجبُور ہو جاتا ہے کہ اشتراکیت کے سوائے

ہر نظریۂ زندگی کے مستقبل سے قطعتہً مایوس ہوجائے۔ لہٰذا اسے عارضی، ناکارہ اور غلط قرار دے ——

برنارڈ شا، کارل مارکس کے اس نظریہ سے وجد میں آگیا اور وہ انتہائی عقیدہ میں ڈوب کر لکھتا ہے : ——

"کارل مارکس کا سر ایک دیوتا کی طرح بلند ہے، کیونکہ اس نے سماج کے ارتقاء کا قانون دریافت کر لیا ہے ——"

لیکن برنارڈ شا اور اس جیسے دوسرے لوگ جو مارکس کے عقیدت مند ہیں محض ایک غلط فہمی کا شکار ہیں کیونکہ سماج کے ارتقاء کا اصلی صحیح قانون ان کے سامنے موجود نہیں۔

مارکس کا نظریہ

کارل مارکس نے اپنے فلسفہ کو مختصر طور پر یوں بیان کیا ہے : ——

"میرے سارے غور و فکر کا مرکزی تصوّر جس سے میں نے تمام دوسرے نتائج اخذ کئے ہیں یہ ہے کہ ایک جماعت کے افراد اپنی اقتصادی ضروریات کی تکمیل کا سامان پیدا کرنے کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ ایک خاص قسم کے معاشی تعلّقات قائم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان تعلقات کے ظہور میں ان کی خواہش یا مرضی کو کوئی دخل نہیں ہوتا اور ان کا سارا دار و مدار کسبِ معاش کے ان قدرتی مادی ذرائع پر ہوتا ہے جو کسی خاص وقت پر موجود ہوں۔ ان تعلّقات کا مجموعہ جماعت کا معاشی نظام کہلاتا ہے اور یہی نظام وہ اصلی بُنیاد ہے جس پر سیاست اور قانون کی ساری عمارت کھڑی کی جاتی ہے جو خاص قسم کے اجتماعی تصوّرات کو پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ گویا مادّی ضروریات کو پیدا کرنے کا طریق انسان کی ساری اجتماعی سیاسی اور رُوحانی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ افسانوں کے نظریات

اور تصوّرات نہیں جو ان کی مادّی زندگی کو معیّن کرتے ہیں بلکہ یہ ان کی مادّی زندگی ہے جو ان کے تصوّرات اور نظریات کو معیّن کرتی ہے، کچھ عرصہ کے بعد ضروریات کی بہم رسانی کے قدرتی ذرائع ترقی کر کے ایک ایسے مرحلہ پر پہنچ جاتے ہیں جہاں وہ افراد کے موجودہ معاشی تعلّقات کے ساتھ جن میں وہ پہلے عمل کرتے رہے ہیں مزاحم ہونے لگتے ہیں۔ اگرچہ یہ تعلّقات خود بھی ذرائع پیداوار کی نشو و نما کی ایک خاص شکل کی حیثیّت رکھتے ہیں تاہم یہ ان کی نشو و نما کے لئے ایک رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں اجتماعی انقلاب کے ایک دَور کا آغاز ہوتا ہے، معاشی بُنیادوں کے بدلتے ہی ان کے اُوپر کی ساری تعمیر (یعنی مذہبی، اخلاقی، روحانی، سیاسی، قانونی اور علمی نظریات و تصوّرات) بتدریج یا فی الفور بدل جاتی ہے۔ اس تغیّر پر غور کرتے ہوئے ہمیں اس مادی تغیّر میں جو ضروریاتِ زندگی بہم رسانی کے لئے ضروری اقتصادی حالات کے اندر رونما ہوتا ہے (اور جس کا صحیح اندازہ لگانا ایسا ہی آسان ہے جیسا کہ قوانینِ طبعی کے عمل کا اندازہ لگانا، اور اس تغیّر میں جو قانونی، سیاسی، مذہبی، ہنری یا علمی تصورات میں مختصر یہ کہ نظریات میں رونما ہوتا ہے اور جس کے ذریعے سے لوگ اس تصادم کا احساس کرتے ہیں اور اسے اپنی جدّوجہد سے انجام تک پہنچاتے ہیں۔ فرق کرنا چاہیئے جس طرح سے ہم ایک فردِ انسانی کی شخصیّت کا صحیح اندازہ اس رائے کی بناء پر قائم نہیں کر سکتے جو وہ اپنے بارہ میں رکھتا ہے اسی طرح سے ہم اس قسم کے اجتماعی تغیّر کے دَور کی ماہیّت کا صحیح اندازہ اس کے تصورات اور نظریات سے نہیں لگا سکتے بلکہ ہمیں چاہیئے کہ ہم ان تصوّرات اور نظریات کا سبب مادی زندگی کے اندرونی تضاد میں یعنی

اس تصادم میں تلاش کریں جو سامانِ زندگی کو پیدا کرنے والی اجتماعی قوتوں اور ان معاشی تعلّقات کے درمیان جن کے ذریعہ سے سامانِ زندگی پیدا ہورہا ہے، رونما ہونے کو تیار ہوتا ہے ——")

اینگلز کا اختصار

مارکس کا ساتھی اینگلز جس نے اشتراکی فلسفہ کی تعمیر میں مارکس کے ساتھ برابر کا حصّہ لیا ہے۔ اسی خیال کو زیادہ مختصر اور زیادہ واضح طور پر یُوں بیان کرتا ہے: ——

" مارکس نے اس سادہ حقیقت کا کھوج لگایا (جو آج تک تصوّرات اور نظریات کی بالائی نشوونما میں چھُپی ہوئی تھی کہ) اس سے پہلے کہ انسان سیاست، علم، ہُنر، مذہب وغیرہ میں دلچسپی لے سکے' یہ ضروری ہے کہ اسے خوراک، پانی، کپڑا اور مکان میسّر ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے اس سامان کی بہم رسانی جو فوری طور پر ضروری ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک قوم یا ایک دَور کی نشوونما کا موجودہ مرحلہ ہی وہ بُنیادیں ہیں جن پر سیاسی رسم ورواج اور قانونی نظریات اور ہُنری بلکہ مذہبی تصوّرات تعمیر کئے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اوّل الذکر کو ایک سبب یا اصل کے طور پر پیش کرنا چاہیئے۔ حالانکہ آج تک، اوّل الذکر کی تشریح کے لئے مؤخر الذکر کو ایک سبب کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے ——"

(قرآن اور علمِ جدید صہ ۲۶)

مادیّت ودہریّت پر

خُدا کی عظمت کا غلبہ

حقیقتِ کائنات مادّہ ہے یا شعور

ڈاکٹر رفیع الدین، پی، ایچ ڈی لکھتے ہیں۔

بظاہر ہمیں کائنات میں صرف دو مختلف چیزیں نظر آتی ہیں۔ ایک مادّہ اور دوسرے شعور! —— کیونکہ تمام چیزیں یا بے جان ہیں یا جاندار۔ تمام بے جان چیزیں مادّی ہیں۔ اور تمام چیزوں کا وصف شعور ہے۔ مادہ اور شعور کے ظاہری اختلاف کے باوجود فلسفیوں اور سائنس دانوں نے اس لاشعوری وجدانی یقین کی وجہ سے کہ کائنات کی آخری حقیقت ایک ہی ہونی چاہیئے۔ ہمیشہ اس بات کی کوشش کی ہے کہ مادّہ اور شعور دونوں کو ایک ہی چیز ثابت کیا جائے

اس لئے یا تو وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ شعور اصل میں مادّہ ہی کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے یا یہ کہ مادّہ درحقیقت شعور ہی کی صفات کا ایک

مظہر ہے۔ انیسویں صدی میں جب ڈارون نے اپنا نظریۂ ارتقا ایجاد کیا تھا۔ سائنس دان اوّل الذکر نقطۂ نظر پیش کیا کرتے تھے۔ اگرچہ فلسفیوں میں سے اکثر لوگ ہمیشہ مؤخرالذکر نظریہ کے حامی رہے ہیں ——

انیسویں صدی کے سائنس دان یہ سمجھتے تھے کہ مادّہ ایک غیر فانی حقیقت ہے اس لئے کسی چیز کی کوئی اصلیت نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے خواص و اوصاف مادّہ کی طرح نہ ہوں، یعنی جب تک اسے مادّہ کی طرح دیکھا یا چھوا نہ جائے یا وہ اس قابل نہ ہو کہ مادّہ کی طرح اس پر عمل میں تجربات کئے جا سکیں، چنانچہ یہ قدرتی بات تھی کہ وہ شعور کو ذی حیات مادّہ کی ایک خاصیت قرار دیتے تھے، یہ لوگ اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ شعور کی مانند کوئی چیز تخلیقِ کائنات کا سبب ہو سکتی ہے۔ یا مظاہر قدرت کے ساتھ اس کا کوئی سروکار یا علاقہ ہو سکتا ہے؟ ان کا خیال تھا کہ شعور مادّہ ہی کی ایک خاص حالت کا وصف ہے جو اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب مادّہ اتفاقاً ایک خاص کیمیاوی ترکیب پا لیتا ہے یا طبعیات کے قوانین کے تحت میں آ جاتا ہے ——

قدیم سائنس دانوں میں سے بائل کہتا ہے کہ "وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ جب متحرک مادّہ کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس سے انسانوں اور حیوانوں کے مکمل اجسام ایسی حیرت انگیز موجودات یا اس سے بھی زیادہ محیّر العقول وہ اجزائے مادّہ جو زندہ حیوانات کے بیج کی حیثیت رکھتے ہیں خود بخود وجود میں آ جائیں، چنانچہ اس مشکل کو حل کرنے کیلئے وہ قدرت کے اندر تعمیر کنندہ روح یا قوّتِ شعور کا ہونا ضروری قرار دیتا تھا"——

بائل کا خیال

اسی طرح انیسویں صدی کے ایک سائنس دان لارڈ کیلون کی ذہانت نے بھی اسے یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور کیا کہ قدرت، شعور کے اوصاف سے بے بہرہ نہیں اور یہ کہ کائنات کے اندر ایک تخلیق اور راہ نما قوّت بھی کارفرما ہے لیکن فلسفہ جو سائنس کی طرح حقیقت

کی کسی جزوی یا محدود واقفیت پر کبھی قانع نہیں ہوا، جو تلاش صداقت میں عقل اور وجدان دونوں سے پورا کام لیتا رہا ہے اور بہت حد تک ان پابندیوں سے بھی آزاد ہے جو تحقیق علم کے بارہ میں سائنس نے اپنے اوپر عائد کر رکھی ہیں۔ یعنی تجربہ اور مشاہدہ کے بغیر کسی چیز کو باور نہ کرنا ہمیشہ اس بات پر اصرار کرتا رہا ہے کہ عقدۂ کائنات کا معقول اور مکمل حل جس کے لئے انسان فطرتی طور پر بیتاب ہے اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ نظام عالم میں شعور کو ایک مرکزی حیثیت نہ دی جائے ــــــ

قرونِ وسطیٰ کے یورپی فلسفہ کا مقصد تو دینِ عیسائیت کی عقلی توجیہ کے سوا اور کچھ نہیں تھا لیکن شعور جیساکہ وہ خدا اور کائنات کے اندر موجود ہے۔ نہ صرف قرونِ وسطیٰ کے فلسفہ کا بلکہ عصرِ جدید کے ان بڑے بڑے فلسفیانہ نظریات کا بھی واحد موضوع ہے جو ڈیکارٹ، لیبنز، شوپن آئر، نیٹشے، کانٹ اسپینوزا، ہیگل، فشٹے، کروچے برگسان ایسے مقتدر فلسفیوں نے پیش کئے ہیں اور جن میں وہ خدا، روح، کائنات، حقیقت مطلقہ، تصورِ مطلق، قوتِ شعور، ارادہ کائنات، شعورِ ابدی، افرادِ حیات، خودشعوری، قوتِ حیات، وغیرہ اصطلاحات سے تعبیر کیا گیا ہے) ــــــ

سائنس کی مادیات پر جس فلسفی نے سب سے پہلے شدید اعتراضات کئے وہ انگلستان کا بشپ جارج برکلے تھا جس نے کہا مادی دنیا اپنی کوئی جدا ہستی نہیں رکھتی۔ کیونکہ اسے ہم فقط حواس کے ذریعے سے جانتے ہیں اور یہ جاننا شعور کے بغیر ممکن نہیں، چونکہ ہمارے شعور سے باہر مادہ کی کائنات کا اپنا کوئی وجود نہیں ہو سکتا، اس لئے جو چیز حقیقتاً موجود ہے وہ شعور ہے نہ کہ مادہ۔ حواس کے ذریعہ سے ہمیں جس چیز کا علم حاصل ہوتا ہے وہ مادہ نہیں بلکہ اس کا رنگ، صورت شکل، آواز، نرمی اور سختی وغیرہ مختلف اوصاف ہیں۔ اور ان اوصاف کو جاننے کے لئے ضروری ہے کہ شعور ان کا احساس کرے۔ اور شعور کے بغیر ان میں سے کوئی چیز بھی موجود نہ ہو سکے گی۔ پس مادہ کی حقیقت فقط شعور ہے ــــ

برکلے اپنے نظریہ کی روشنی میں ایک غیر فانی اَبدی شعور کی ہستی کو ثابت کرنے کیلئے یوں دلیل قائم کرتا ہے :۔

"آسمان کے تمام ستارے، زمین کی تمام چیزیں مختصر یہ کہ وہ تمام اشیاء جن سے یہ عظیم الشان دُنیا بنی ہے شعور کے بغیر کوئی وجود نہیں رکھتیں، اگر میں ان کا احساس نہ کروں یا کسی اور مخلوق ہستی کے شعور کے اندر موجود نہ ہوں تو پھر یا تو ان کا کوئی وجود ہی نہیں یا ان کا وجود کسی اَبدی شعور کے عِلم میں ہے۔"

برکلے کی اس تصوریّت کو حال ہی میں ایک جدید فلسفہ سے جسے نوتصوریت کہا جا ہے اور جس کے بڑے شارحین اٹلی کے دو فلسفی کروچے اور جینٹلے ہیں۔ بہت مضبو سہارا مل گیا ہے۔ یہ دونوں فلسفی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کائنات رُوح کے سوائے اور کچھ نہیں۔ ان کا فلسفہ نہ صرف زمانہ کے لحاظ سے جدید ترین ہے بلکہ سے حکماء کا خیال ہے کہ اس دَور کے فلسفیوں میں سے ایک نہایت ہی اچھوتا یقین افروز فلسفہ ہے اور یہ فلسفہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ :۔

"ہمارے شعور کا احساس ہی ایک چیز ہے جس کی حقیقت کے بارے میں ہمیں کوئی یقین ہو سکتا ہے۔"

اس مفروضہ سے قدم بقدم استدلال کرتے ہوئے یہ فلسفی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اگر کائنات کی حقیقت کوئی ایسی چیز ہے جسے ہم جان سکتے ہیں تو وہ لامحالہ ہمارے اپنے شعوری تجربہ یا احساس کے ساتھ مماثلت رکھتی ہے اور چونکہ خود شعوری واضح ترین اور بلند ترین احساس ہے اس لئے کائنات کی حقیقت لازماً ایک اعلیٰ قسم کی خود شعوری

اُنیسویں صدی کی فرسودہ سائنس

جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے اُنیسویں صدی کے سائنس دانوں کے نزدیک تو

کے خیالات کو قبول کرنا ناممکن تھا، کیونکہ ایسا کرنے سے ان کے مادّی قوانین کی بنیاد ہی اُکھڑ جاتی تھی۔ جب برکلے نے نیوٹن کے طبیعیاتی قوانین پر سب سے پہلے اعتراض اُٹھایا تو سائنسدانوں نے ایک نفرت انگیز طعن و تشنیع کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ کسے خبر تھی کہ اس بحث میں کہ آیا مادّہ حقیقی ہے یا شعور۔ فلسفی جلد ہی سائنس دانوں پر غالب آجائیں گے اور وہ بھی سائنس دانوں کو اپنی تحقیقات اور اپنے ہی انکشافات کی بدولت۔

سائنس اپنے بُت کو خود توڑتی ہے

فلسفی تو مدّت سے کائنات کی ایک ایسی تشریح پر مصر تھے جو حقیقت شعور پر مبنی تھی، اگر ان کا نقطۂ نظر ایک عام قبولیت حاصل نہ کر سکا تھا تو اس کی وجہ فقط سائنس ہی رکاوٹ تھی۔ لیکن اب بیسوی صدی کے سائنس کے اکتشافات نے جن میں نظریۂ اضافیت، نظریۂ کوانٹم اور علمِ حیات کے بعض حقائق شامل ہیں یہ رکاوٹ دُور کر دی ہے اور مادیات کا بُت جسے سائنس نے تراشا تھا سائنس ہی کے ہاتھوں چُور چُور ہو گیا ہے۔ طبیعیاتِ جدید کی تحقیق نے مادّہ کو جو کسی وقت ایک ٹھوس، سادہ اور روشن حقیقت کا درجہ رکھتا تھا اور اس کے ساتھ ہی قوّت، حرکت، فاصلہ، وقت اور ایتھر کو محض لاشئے میں بدل دیا ہے۔ ڈاکٹر جوڈ کے الفاظ ہیں:-

"جدید مادّہ ایک ایسی بے حقیقت چیز ہے جو ہاتھ میں نہیں آسکتی، یہ فاصلہ اور وقت کے مرکّب کا ایک اُبھار، برقی رَو کا ایک جال یا امکان کی ایک لہر ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے فنا کے اندر کھو جاتی ہے۔ اکثر اوقات اسے مادّہ کی بجائے دیکھنے والے کے شعور کا ہی ایک پھیلاؤ سمجھا جاتا ہے۔"

نظریۂ اضافیت کے نتائج

پروفیسر روز نے نظریۂ اضافیت سے پیدا ہونے والے نتائج سے بحث کرتے

ہوئے اپنی کتاب "فلسفہ اور طبیعیاتِ جدید" میں لکھتا ہے :ـــــــ

"اس طرح مادّہ الیکٹرانوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جو خود لطیف لہروں کی صورت اختیار کرتے ہوئے فنا ہو جاتے ہیں۔ گویا مادّہ کا مستقل نقصان اور قوّت کا ناقابلِ تلافی انتشار عمل میں آتا ہے۔ دوام مادّہ کے اس ہمہ گیر اصول کی بجائے جسے سائنس دانوں نے سائنس کی بُنیاد قرار دیا تھا اور جو اسے قابلِ فہم بناتا تھا، یعنی نہ تو کوئی چیز وجود میں آتی ہے اور نہ فنا ہوتی ہے۔ اَب ہمیں یہ متضاد اصول وضع کرنا چاہیئے کہ کوئی چیز وجود میں نہیں آتی۔ ہر چیز فنا ہو جاتی ہے۔ دُنیا ایک آخری بربادی کی طرف بڑھتی چلی جارہی ہے۔ اور ایتھر جس کے بارہ میں ناحق یہ دعویٰ کیا جاتا تھا کہ وہ کائنات کا آخری سہارا ہے۔ کائنات کی آخری قبر ثابت ہوتی ہے"

ہیری شمٹ کا تبصرہ

ڈاکٹر ہیری شمٹ نے اپنی کتاب میں "اضافیت اور کائنات" میں یہ بتاتے ہوئے کہ نظامِ عالم میں اضافیت کے داخل ہونے کے بعد کائنات کی کیفیت کیا رہ جاتی ہے۔ بڑے مایوسانہ انداز میں لکھا ہے :ـــــــ

"فاصلہ اور وقت بے حقیقت ہو کر رہ گئے ہیں، خود حرکت بے معنی ہو گئی ہے۔ اجسام کی شکل وصورت ہمارے نقطۂ نظر پر موقوف ہو گئی ہے اور کائنات کی ایتھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت کر دی گئی ہے ـــــ

افسوس! تم نے خوبصورت دُنیا کو ایک شدید ضرب کے ساتھ برباد کر دیا۔ اَب یہ ٹوٹ پھوٹ چکی ہے اور اس کے ٹکڑے مُنتشر کر دیئے گئے ہیں۔ اَب ہم ان ٹکڑوں کو فنا کے سپرد کرتے ہیں اور بڑے درد کے ساتھ اُس حُسن کا ماتم کرتے ہیں جو مِٹ گیا ہے۔"

شعور حقیقتِ کائنات ہے!

لیکن اگر مادّہ حقیقی اور پائیدار نہیں تو پھر مادّہ کے ثابت ہونے پر ہم مخلوقات کی اس بوقلمونی اور رنگارنگی کی وجہ کیا بتا سکتے ہیں جس میں جا بجا حسنِ کار، ہنر، مُدعا، تناسب، ہم آہنگی اور بے خطار یاضیاتی ذہن کے اوصاف کار فرما نظر آتے ہیں۔ یقیناً یہ سب شعور ہی کے اوصاف ہیں۔ لہٰذا شعور ہی کائنات کی وہ آخری حقیقت ہے جس سے دُنیا جگمگا رہی ہے:۔

ماہرینِ طبعیات کی تلاشِ حقیقت

ظاہر ہے کہ مادّہ کے فانی ثابت ہونے کے بعد اس نظریہ کیلئے کہ کائنات کی بُنیاد رُوح یا شعور ہے۔ نہ صرف راستہ صاف ہو گیا ہے بلکہ اب اس نظریہ کے تسلیم کرنے کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ آج رُوح یا شعور کو کائنات کی حقیقت قرار دینا عقلی طور پر اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ انیسویں صدی میں یہ ماننا ضروری تھا کہ کائنات فقط مادّہ سے بنی ہے۔ فلسفہ تو اپنی ساری تاریخ میں سائنس کی تائید کے بغیر بلکہ سائنس کی مخالفت کے باوجود کائنات کی روحانی توجیہہ پر اصرار کرتا رہا ہے اور فلسفہ کا یہ نظریہ قدیم سائنس کے مادیاتی نظریہ سے کسی طرح سے معقول یا قابلِ قبول نہیں تھا۔ لیکن اب سائنس بھی اس کی تائید میں وزن دار شہادت پیش کر رہی ہے ــــــ

چونکہ مادہ بے حقیقت اور فانی ثابت ہو لہے۔ لہٰذا طبعیات کے ماہرین محسوس کرنے لگے ہیں کہ اب وہ مادّہ کی دُنیا کے اندر محدود رہ کر طبعیات کے مسائل کو حل نہیں کر سکتے اور مجبور ہیں کہ مادّہ کی دُنیا سے آگے نکل کر سچّائی کی جستجو کریں، کیونکہ اب مادّہ کی حقیقت مادّہ سے پرے کی دُنیا میں ہی معلوم کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انگلستان اور یورپ کے بہت سے ماہرین طبعیات مثلاً ایڈنگٹن، جینز، وائٹ ہیڈ، آئن سٹائن، شروڈنگر اور پلینک مادّی دُنیا کی حقیقت کی وضاحت رُوحانی نقطۂ نظر سے پیش کر رہے

ہیں۔ اب وہ ماہرین طبیعات ہی نہیں بلکہ ماہرین ماوراء الطبیعات بھی ہیں۔ ان سب سائنس دانوں کے دلائل اس مفروضہ کی تاکید کرتے ہیں کہ کائنات کی حقیقت ایک شعور یا ذہن ہے۔!

نظریہ کوانٹم کے موجد پروفیسر ماکس پلانک کے ساتھ مسٹر جے۔ ڈبلیو۔ این۔ سلیون کی ایک گفتگو ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کے رسالہ آبزرور میں شائع ہوئی تھی اس میں پروفیسر پلانک نے کہا تھا:۔

" میں شعور کو ایک بُنیادی حقیقت سمجھتا ہوں، مادّہ کو شعور کا نتیجہ سمجھتا ہوں ہم شعور سے آگے نہیں جا سکتے، ہر چیز جس کا ہم ذکر کرتے ہیں یا جس کو موجود تصوّر کرتے ہیں اس کی ہستی شعور پر مبنی ہے"۔

آئن سٹائن لکھتا ہے:۔

" کائنات پر شعور کی حکومت ہے خواہ یہ شعور کسی ماہر ریاضیات کا سمجھا جائے یا کسی مصوّر کا یا شاعر کا، یہی وہ حقیقت جو ہستی کو معنی خیز بناتی ہے ہماری روزمرّہ کی زندگی میں رونق پیدا کرتی ہے۔ ہماری اُمید کو بڑھاتی ہے اور جب علم ناکام رہ جاتا ہے تو یقین کے ساتھ ہمیں قوّت بخشتی ہے۔"

سر جیمز جینز کا استدلال یہ ہے کہ مادّہ سب کا سب ریاضیاتی نسبتوں میں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ ریاضیات کا دخل جس طرح سے سالمہ کی ہیئت ترکیبی میں نظر آتا ہے، اسی طرح سے اجرامِ فلکی کے نظامات میں بھی موجود ہے۔ ریاضیات کے قوانین جس طرح قریب ترین مادّی اشیاء پر حاوی ہیں۔ اسی طرح کائنات کے دُور دراز حصّوں پر بھی حکمران ہیں لیکن ریاضیات کا علم جس قدر ہمیں اس وقت حاصل ہُوا ہے مطالعہ سے حاصل نہیں ہُوا بلکہ ہمارے اپنے منطقی یا عقلی استدلال سے حاصل ہُوا ہے جس کا کائنات کے مطالعہ سے کوئی تعلّق نہیں، اپنی قوّتِ استدلال کی رہنمائی میں اپنے ہی ذہن کی پیداوار کے طور پر قوانینِ ریاضیات کو مرتّب کرنے کے بعد جب ہم کارخانہ قدرت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ دیکھ کر

ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ نہ صرف کائنات کی تعمیر ان قواعد کے عین مطابق ہوئی ہے بلکہ یہی قوانین اس کائنات کی آخری صورت ہیں چونکہ مادہ غیرفانی حقیقی ہے۔ اس لئے کائنات آخر کار قوانین ریاضیات کے ایک مجموعہ کے بغیر کچھ ثابت نہیں ہوتی، ہم نے ان قوانین کو جو ہمارے باہر کی دُنیا میں جاری اور ساری ہیں خود بخود کیونکر دریافت کرلیا اور پھر یہ قوانین مادّی دُنیا کی تعمیر میں خود بخود کیونکر کام آئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات ہماری طرح کے ایک شعور کی تخلیق ہے۔ یہ شعور ہماری طرح ٹھیک ٹھیک ریاضیاتی اور منطقی انداز کے ساتھ سوچ سمجھ سکتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ خارج کی دُنیا اور ہمارا اپنا شعور دونوں اسی شعورِ عالم نے پیدا کئے ہیں :۔

سر جیمز جینز اپنی کتاب "پُراسرار کائنات" میں لکھتا ہے :۔

"کائنات کسی مادّی تشریح کی متحمل نہیں ہوسکتی اور میری رائے میں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی اپنی حقیقت ایک خیال سے زیادہ نہیں۔ آج سے تیس سال پہلے ہم یہ سمجھتے تھے یا فرض کرتے تھے کہ ہم ایک آخری میکانکی حقیقت کی طرف بڑھے چلے جارہے ہیں۔ آج کی دُنیا بہت حد تک اس بات پر متفق ہے اور جہاں تک علم طبعیات کے ماہرین کا تعلّق ہے اس رائے کے ساتھ اختلاف قریباً مفقود ہے کہ علم کا دریا ایک میکانکی حقیقت کی طرف بہ رہا ہے۔ کائنات ایک بڑی مشین کی بجائے ایک بڑے تصوّر کی صورت میں نظر آنے لگی ہے۔ اب شعور کوئی ایسی چیز نہیں جو مادّہ کی دُنیا میں اتفاقاً داخل ہوگئی ہو بلکہ اس کی بجائے ہم یہ شبہ کرنے لگے ہیں کہ ہمیں شعور ہی کو مادّہ کی دُنیا کا خالق اور حکمران قرار دینا چاہیئے۔ ہمارے شعور کو نہیں بلکہ اس شعور کو جس کے اندر وہ سالمات جن سے ہمارا شعور صورت پذیر ہُوا ہے۔ خیالات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جدید علم ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم اپنے پہلے جلد بازی سے قائم کئے

ہوئے تاثرات پر کہ ہم اتّفاق سے ایک ایسی دُنیا میں آپہنچے ہیں جو زندگی سے کچھ سروکار نہیں رکھتی یا زندگی سے عملاً عداوت رکھتی ہے، نظرِ ثانی کریں، اغلب ہے کہ مادّہ اور شعور کی قدیم دوئی جو اس فرضی عداوت کی ذمّہ دار تھی بالکل ناپید ہوجائے، نہ اس لئے کہ مادّہ اور بے حقیقت ثابت ہوجائیگا بلکہ اس لئے کہ ٹھوس اور حقیقی مادّہ آخر کار شعور ہی کی ایک مخلوق اور شعور ہی کا ایک ظہور[1] مانا جائے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات ایک ایسی مدبّر اور منظم ہستی کا پتہ دیتی ہے جو ہمارے شعور کے ساتھ کچھ نہ کچھ مشابہت[2] رکھتی ہے جس حد تک ہمیں علم ہو سکا ہے۔ جذبات، اخلاق اور احساسِ حُسن کے اوصاف کے لحاظ سے نہیں بلکہ ایک ایسے اندازِ فکر کے لحاظ سے جسے ہم کسی بہتر لفظ سے تعبیر نہ کرسکنے کی وجہ سے ریاضیاتی اندازِ فکر کہتے ہیں ــــــ"

(قرآن اور علمِ جدید ص۱۷۱)

---

[1] و [2] ظہور اور مشابہت کا نظریہ درست نہیں۔

وحدتِ وجود کے نظریئے میں

توحید کی تعبیر

وحدتِ وجود کا مسئلہ صدیوں سے حکما، صوفیہ، اہلِ کلام اور اہلِ ظواہر تمام طبقوں میں معرکہ خیز رہا ہے۔ یہ مسئلہ دینی زندگی کے اندر سے نہیں اُبھرا، اسلامی اور دینی زندگی تو صدرِ اسلام میں خالص ترین صورت میں موجود تھی۔ نہ رسولِ کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس کو کوئی اہم مسئلہ بنایا اور نہ صحابۂ کرامؓ اس بحث میں پڑے۔ اسلام کا اصل مقصد توحید کی تبلیغ تھی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ اللہ کے سوا زمین و آسمان میں یا ماورائے ارض و سما، دوسرا کوئی معبود نہیں۔ فقط اسی ایک معبود کی عبادت کی جائے۔ اسی کو ربّ اور مالکِ جزا و سزا یقین کیا جائے، اسی کی طرف یکسو ہو کر رُخ کیا جائے۔ نہ فطرت کے مظاہر کی پرستش کی جائے۔ اور نہ انسان ایک دوسرے کو مِن دُون اللہ ارباب بنالیں۔ خالق ایک ہی ہے جو مخلوق کو عدم سے وجود میں لاتا اور پھر جسے چاہے وجود سے عدم میں واپس لے جاتا ہے۔ انسان اپنی مرضی کو اس کی مرضی سے ہم کنار کر کے سعادتِ دارین حاصل کر سکتا ہے۔ خالص اسلامی توحید یہی تھی اور اسلام کا یہ دعویٰ تھا کہ یہی دین قدیم اور دینِ مستمر ہے۔ ہر نبی کی تعلیم کا مقصد اصل میں یہی تھا۔ شرائع اور ضوابط کا اختلاف مرورِ ازمنہ اور تغیرِ احوال سے ظہور میں آتا رہا۔ لیکن شعائر اور طریقِ عبادت کا فرق فروعی ہے۔ جہاں توحید

ہے وہاں سب کچھ ہے اور جہاں توحید نہیں وہاں تمام ظواہر بے مغز چھلکا ہیں ــــــ

وحدتِ وجود کا مسئلہ وہاں پیدا ہوا جہاں دین میں علم کلم اور فلسفے کی آمیزش ہوئی ہندوؤں میں اس مسئلے نے ویدانت کی صورت اختیار کرلی جس کے اندر خدا یا ایشور ایک اعتباری مظہری اور اضافی تصوّر بن گیا، وہ ہستی مطلق نہ رہا ــــــ ویدانت نے یہ تعلیم دی کہ ہستی مطلق ایک ذات بحت ہے جو صفات سے معرّا ہے، نرگن برہما ہی اصل ہستی ہے۔ اس میں خالقیّت کی صفت بھی نہیں جس کو مخلوقات کہتے ہیں وہ فریبِ نظر اور وہم کی آفرینش ہے۔ عالم النفس وآفاق تمام مایا ہے جس کی کچھ حقیقت نہیں۔ روحِ انسان کی انفرادیت سب سے بڑا دھوکا اور ہر قسم کے فریب کا ماخذ ہے، اصل وجود ایک ہی ہے جس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے، آتما کو اگر صحیح عرفان ہوجائے تو اس کو معلوم ہو کہ وہ پرماتما کے سوا کچھ نہیں ــــــ سمندر کے علاوہ موج وحباب کا کوئی وجود نہیں۔ یہ لاالٰہیّت کا نظریہ ہے جس کا قدم الّا اللہ کی طرف نہیں اٹھتا۔ اس میں نفی مسلّم ہے اور اثبات موہوم، ذاتِ بے صفات کے سوا باقی سب کچھ معدوم ــــــ

سنکراچاریہ جو ویدانت کا سب سے بڑا مفسر ہے اس کا نظریہ بھی یہی ہے ــــــ

بدھ مت بھی اسی لاموجودیت اور لاکونیّت کی تبلیغ ہے۔ بدھ مت میں کہیں خدا کا تصوّر نہیں، نفسی مظاہر اور طبیعی مظاہر سب آرزوئے حیات کی پیداوار ہیں نہ نفس کی کچھ حقیقت ہے اور نہ آفاق کی۔ آرزوئے حیات کی نفی کے بعد یہ ناپید ہوجاتے ہیں کیونکہ ان کی ہستی سیمیائی ہے، صبحِ معرفت کے طلوع ہونے کے بعد وہ معدوم ہوجاتے ہیں ــــــ

۵ یہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود ؛ صبح کو رازِ مہ واختر کھلا (غالبؔ)

یونانی فلسفہ ترقی کرتے کرتے سقراط اور افلاطون کے نظریۂ علم وجود تک پہنچا کہ ہستی مطلق عقلِ کل ہے جو کلّی تصوّرات کا ایک وحدانی نظام ہے۔ یہ کلّی تصورات جسے مثلِ افلاطونی یا اعیانِ ثابتہ کہتے ہیں[1] ایک ابدی حقیقت ہیں یہ کسی نفس کے تصوّرات نہیں بلکہ علی الاطلاق

---

[1] وحدۃ الوجود کے نظریئے میں اعیانِ ثابتہ کی اصطلاح اہم مقام رکھتی ہے۔ اور یہ (باقی اگلے صفحہ پر)

ہر شئے کی حقیقت اتنی ہے جتنا کہ اس کو نورِ ازلی سے حصّہ ملا ہے۔ جس طرح سورج کی کسی کرن کا وجود بالذات اور مستقل نہیں۔ اسی طرح تنزلات کے کسی درجے میں بھی کوئی شئے مستقل انفرادی وجود نہیں رکھتی ———

وحدتِ وجود کا یہ نظریہ مسلمانوں کے ہاں بھی فلسفہ تصوّف کا ایک اہم جزو بن گیا، اور مغرب میں عیسوی تصوّف پر بھی اس نے پائیدار نقش چھوڑے ہیں۔ یہ نظریہ ویدانت اور بدھ مت کے نظریہ وجود سے مختلف ہے۔ اور سقراط اور افلاطون اور ارسطو کی تعلیم کو بھی پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ جہاں عقلِ کُل ہی ایک ابتدائی اور انتہائی حقیقت ہے۔ فلاطینوس کے ہاں ہستی مطلق ماورائے عقل ہے ———

وجود کی وحدت ضروری نہیں کہ عقل کی وحدت یا خُدا کی وحدت ہی کے ساتھ وابستہ ہو۔ یونانی فلسفے کا آغاز یہاں سے ہوا کہ تمام موجودات کی اصلیت پانی ہے اور جو کچھ ہے وہ پانی ہی کی ایک مبدّل صورت ہے اس کے بعد دوسروں نے کہا کہ پانی نہیں بلکہ آگ ہے ——— افلاطون کے ہم عصر دیمقراطیس نے ذراتی مادیت کی بنا ڈالی کہ حیات کی حقیقت مادہ ہے جس کے اندر لامتناہی اجزائے لایتجزیٰ ہیں انہیں اجزا کی بدلتی ہوئی ترکیبوں سے چیزیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ تمام کون و فساد اِن مادّی ذرّات ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ نظریہ مادّی وحدتِ وجود ہے جس کا تعلّق نہ عقل کی وحدت سے ہے اور نہ نفس یا خدا کی وحدت سے ———

اسلامی تصوّف میں جو نظریۂ وحدتِ وجود ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے سوا اور کسی چیز کا وجود نہیں، ہمہ اوست، جو کچھ ہے وہ خُدا ہی کی ذات کا مظہر ہے ہستی ایک ہی ہے تمام مختلف مخلوق میں ہستی مشترک ہے۔ اور وہ ہستی خدا ہے۔ ایک فارسی متصوّف شاعر کے دو اشعار کا مضمون یاد رہ گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: اے خدا تُو مجھے دھمکی دیتا ہے کہ میں تجھے دوزخ میں ڈال دوں گا۔ مجھے یہ بتا کہ دوزخ کا وجود ہے کہ نہیں اگر اس کا

وجود حقیقی ہے تو وہ تیرے بغیر نہیں ہے تو دوزخ معدوم ہے[1] ——

مسلمانوں میں جب وجود کی وحدت کی بحث شروع ہوئی تو اکثر صوفیوں نے اپنا کلمہ بھی عام مسلمانوں سے الگ کر لیا۔ مسلمان کہتا تھا لا الٰہ الا اللہ بعض صوفی کہنے لگے لا موجود الا اللہ۔ لا موثر فی الوجود الا اللہ۔ اللہ کے سوا کچھ موجود نہیں اور ہر وجود میں موثر حقیقت ہے وہ خدا ہی ہے ——

اسلامی توحید کی تعلیم یہ تھی کہ خدا کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ اب ایسے لوگ آ گئے جو کہنے لگے کہ خدا کے سوا اور کوئی موجود ہی نہیں تو عابد اور معبود کا فرق ہٹ جائیگا اور پرستش کی حقیقت کچھ نہ رہے گی[2] ——

غالبؔ نے اس نظریئے کو اپنے فارسی کلام میں اس طرح بیان کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے

" خدا نے اپنے سے علاوہ دوسروں کے موجود ہونے کا وہم پیدا کر کے خواہ مخواہ دنیا میں ایک ہنگامہ مچا دیا ہے۔ حرفِ کُن کہہ کر اور موجودات کو ہستی کا انداز دے کر خود اپنی ہستی کو گمان میں مبتلا کر دیا ہے۔ آنکھوں کے اندر بھی آپ اور باہر بھی آپ دیکھنے والا بھی خود اور دکھائی دینے والا بھی خود، اپنی ہی دونوں حیثیتوں کے درمیان رسمِ پرستش کا ایک وہمی پردہ لٹکا دیا ہے۔ لیکن خود غالبؔ کو اپنا یہ نظریہ مطمئن نہ کر سکا وہ حیرت میں ڈوب کر پوچھنے لگتا ہے :——

ے جب کہ تجھ بِن نہیں کوئی موجود ؛ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

---

[1] — اسی نظریئے کے تحت ابن عربی کے نزدیک دوزخ عذاب کا مقام نہیں ہے بلکہ ایک راحت کی جگہ ہے ——

[2] — صوفی عبدالرحمٰن لکھنوی نے اپنی کتاب کلمۃ الحق میں تصریح کی ہے۔ موجودہ مسلمانوں کا کلمہ صحیح نہیں ہے۔ کلمے کا صحیح معنی یہ ہے کہ جس باطل معبود کی بھی پرستش کی جائے حقیقت میں وہ اللہ ہی کی عبادت ہے۔

سبزہ و گُل کہاں سے آئے ہیں ؛ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا چیز ہے

اور جگہ کہتا ہے کہ :۔۔۔

ے ہاں کھائیو مت فریب ہستی ؛ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

ہر چند ہر ایک شئے میں تو ہے ؛ پر تجھ سی تو کوئی شئے نہیں ہے

ے مشکل حکایتے است کہ ہر ذرّہ عین اوست ؛ لیکن نمی تواں کہ اشارت باو کنند

صاحبِ مفتاح العلوم مولوی محمد نذیر صاحب فرماتے ہیں کہ :۔۔۔

"وحدت الوجود کے قائل صوفیہ کہتے ہیں کہ وجودِ مطلق ایک ہے جو وجوب و امکان قدیم و حادث مجرّد و جسمانی مومن و کافر طاہر و نجس وغیرہ مختلف مظاہر میں ظاہر ہے لیکن ہر مظہر کا حُکم جُدا ہے اور مظاہر کے احکام میں فرق قائم کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ مومن کیلئے نجات کا حکم ہے اور کافر کے لئے قتل و قید کا حکم ہے۔" لوائح جامی میں بھی یہی تعبیر ہے۔

ے ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد ؛ گر فرق مراتب نکنی زندیقی (جامی)

اس کے بعد فتاوی عزیزی میں سے شاہ عبدالعزیزؒ کی یہ عبارت نقل کی ہے۔

"اوّل معنی ایں کلمہ باید فہمید باز حقیقتِ حال باید شنید کہ وجودِ حقیقی بمعنی ما بہ الموجودیت نہ بمعنی مصدری اعتباری یک چیز است کہ در واجب و در ممکن ممکن و در جوہر جوہر و در عرض عرض ست۔ و ایں اختلافات موجب اختلافات در ذات نمی شوند، مثلِ شعاعِ آفتاب کہ بر پاک و ناپاک می افتد و فی ذاتہٖ پاک است ناپاک نمی شود، و ایں مسئلہ فی نفسہٖ حق است و ہیچگونہ خلافِ شرع نیست۔ زیراکہ ہر مرتبہ از مراتب ایں وجود حقیقی حکمے جُداگانہ دارد و شرع شریف بیان حکم ہر مرتبہ مے کند لبعضے را ہادی و لبعضے را مضل و لبعضے را واجب الاطاعت و لبعضے را واجب العصیان و لبعضے احلال

/

و بعضے را حرام و بعضے را پاک و بعضے را ناپاک مے فرماید، مردم کوتاہ بیں داانند کہ ایں ہمہ اختلافات ذات است۔ حاشا وکلا ایں ہمہ اختلافات شیون و اعتبارات است مانند آنکہ در معرکہ جنگ غیر از جسم نمود انمی باشد، اگر قاتل است جسم است و اگر مقتول است جسم، ست، وعلی ھذا لقیاس۔ راکب و مرکوب و غالب و مغلوب در قرآن مجید چند جا اشارہ بایں مسئلہ واقع شدہ صریح ترین آیات بریں مسئلہ ایں است سنریھم آیٰتنا فی الافاق و فی انفسھم حتّٰی یتبین لھم انہ الحق اولو یکف بربک انہ علیٰ کل شیءٍ شھید۔ الا انھم فی مریۃٍ من لقاءِ ربھم الا انہ بکل شیءٍ محیط ونیز آیہ ھو الاول والاٰخر والظاھر والباطن“ [1]

قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی اپنے رسالہ وحدت الوجود میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

”اللہ تعالیٰ خود اپنے وجود میں اور اپنے توابع کے وجود میں غیر کا محتاج نہیں بلکہ اس کی ذات ہی اس کے وجود کی مقتضی ہے اور اس کی ذات ہی اپنے ارادے کے موافق ممکنات کے وجود کا تقاضا کرتی ہے۔ ممکن کا مابہ الموجودیت کیا ہے؟ اس کے وجود سے ارادہ الٰہی کا تعلّق ہے اور یہ ارادہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ اور اس ارادہ کا تعلّق اللہ تعالیٰ کی ذات کا مقتضا ہے کوئی دوسری چیز درمیان میں واسطہ نہیں ہے۔ پس ممکنات کا مابہ الموجودیت ذاتِ حق کے سوا اور کچھ نہیں۔ اب ذاتِ حق تعالیٰ کو وجود بمعنی مابہ الموجودیت کہنا بالکل حق اور صواب ہے اور اس کا تمام اشیاء پر احاطہ جو قرآن کریم سے ثابت ہے اس کے

---

[1] شاہ عبدالعزیز دہلویؒ اپنی سابقہ تحریر کو قرآن کی اس آیت کے ساتھ مؤید کر رہے ہیں۔ یہ آپ کا سراسر غلو ہے اور قرآن کی سراسر تحریف ہے، دیکھئے وحدۃ الوجود ایک ایسا خطرناک نظریہ ہے جس نے بڑے بڑے اکابر کو جادۂ مستقیم سے ہٹا دیا ہے ۔ (اسدی)

یہ معنی ہیں کہ تمام اشیاء کا مابہ الموجودیت وہی اللہ تعالیٰ ہے اور اس کو وجود مطلق لابشرطِ شیٔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی ذات جس طرح اپنے وجود کی مقتضی ہے اسی طرح اپنی تمام صفات کمال مثلاً سمع، حیات بصر، علم، قدرت، ارادت اور کلام کے وجود کی بھی مقتضی ہے اسی لئے اس کی ذات کو واجب بالذّات کہتے ہیں اور اس کی صفات کو جو اہل اسلام کے نزدیک ذات پر زائد ہیں واجب بالغیر ہیں ۱ھ"۔

اکثر صوفیا اور حکماء اس مسئلے سے دست و گریباں ہوئے ہیں جو کچھ انہوں نے بیان کیا ہے اس کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی۔ یہ تمام جنگ فقط الفاظ کا ہیر پھیر اور اصطلاحات کی آویزش معلوم ہوتی ہے۔ جناب مولانا احمد حسن کانپوریؒ اور شیخ ولی محمدؒ سے کچھ عبارتوں سے اقتباسات اس غرض سے نقل کئے جاتے ہیں کہ قارئین کو اندازہ ہو جائے کہ عقلِ استدلالی نے اس گتھی کو سلجھانے کی بجائے کس قدر اور الجھا دیا ہے

مولانا احمد حسنؒ صاحب فرماتے ہیں کہ :۔

"حکمائے کے نزدیک عالم قدیم زمانی ہے جس سے پہلے کوئی عدم خارجی نہیں یعنی یہ بات نہیں کہ عالم کسی وقت خارج میں موجود نہیں تھا پھر موجود ہو گیا، ہاں اگر عالم کے لئے حدوث ہے تو حدوثِ ذاتی ہے جس سے ان کا مطلب یہ ہے کہ عالم سے پہلے عدم مرتبہ ذاتِ عقل میں ہے نہ کہ خارج اور واقع میں اور عالم کا ذاتِ واجب کی طرف محتاج اور اس سے مؤخر ہونا لحاظِ عقل میں ہے جیسے ہاتھ اور قلم کی حرکت، کہ قلم کی حرکت اپنے وجود میں حرکتِ دست کی محتاج ہے وہ لحاظِ عقل میں اس سے متاخر بھی ہے نہ کہ بحسب زمان متاخر، کیونکہ بحسبِ زمان وہ اس سے مقارن ہے"۔

آئمہ متکلمین کہتے ہیں کہ عالم حادث بحدوثِ زمانی ہے یعنی ایک وقت ایسا تھا کہ یہ عالم موجود نہ تھا پھر پیدا ہوا۔ اور یہ نظریہ قرآن کے عین مطابق ہے"۔

۱ھ مولانا ثناء اللہ پانی پتی کی یہ تصریح بھی قرآن کے سراسر خلاف ہے۔ (اسدی)

وجودی صوفیہ کہتے ہیں کہ عالم حادث ہے لیکن حدوثِ زمانی سے نہیں جیسے کہ متکلّمین کا زُعم ہے اور نہ حدوثِ ذاتی کے ساتھ جو حکما کا خیال ہے، بلکہ ان دونوں کے ماورے ایک ایسے حدوث کے ساتھ جو واقعی اور نفس الامری ہے یعنی عالم اپنی ذات کے لحاظ سے خارج میں معدوم ہے مگر فیض حق اور قابلیّتِ اعیان کے ساتھ موجود ہے۔ جیسے اشکال و اَلوان اپنی ذات کے لحاظ سے تاریک ہیں اور اُن کی نمائش نُورِ آفتاب کے فیض اور نورِ چشم کے قبول کے ساتھ ہوتی ہے۔ اگر ان میں سے ایک نُور مفقود ہو تو وہ اشکال والوان اسی طرح تیرہ و نابود ہو جاتے ہیں ——

چونکہ افاضۂ حق اور قابلیتِ اعیان دائمی ہے۔ پس عالم بحسب زمان قدیم ہوا لیکن جب ذاتِ عالم پر نظر کریں تو اشیاء کا وجود عدم کے بعد ہوا۔ بلکہ اشیاء ہر آن میں حادث ہوتی ہیں ——

صاحبِ مفتاح العلوم فرماتے ہیں ——

" واضح ہو کہ اگر عالم کو قدیم مانا جائے تو اس پر لازم آتا ہے کہ اس کی صورتِ موجودہ اور ہیئّت حاضرہ دائمی و اَبدی ہو جو قیامت وحشر کے عقیدہ سے معارض ہے۔ لہٰذا محقّقین صوفیہ کے مسلک پر یہ شُبہ عارض ہو سکتا ہے۔ وہ کسی حد تک حکمائے کے مذہب کے مشابہ ہے جو حشر و نشر کے منکر ہیں لیکن بعض صوفیۂ قدیم عالم کے قائل ہیں اور ان کے کلام سے کہیں صراحتہً اور کہیں کنایتہً یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ وہ موجودہ عالم کے دَوام کے معتقد ہیں —— قرآن مجید کی بہت سی آیات ظاہر المعنی بصورتِ جمہوری پکار رہی ہیں کہ دُنیا کی یہ موجودہ حالت استمراراً قائم نہیں رہی بلکہ اس میں ایک عظیم تغیّر آنے والا ہے۔ تاہم لازم ہے کہ ہم صوفیہ علیہ کے متعلّق کسی بدگمانی کو اپنے دل میں راہ نہ پانے دیں[1] خصوصاً جب ہم یقین رکھتے ہیں کہ یہ لوگ سوادِ اسلام کی ایک برگزیدہ جماعت ہیں۔ پھر اس برگزیدہ گروہ کی بابت یہ ارشاد ہے کہ ان کو کشف و ذوق سے حدوث و قدم کا باہمی رابطہ معلوم ہو گیا

---

[1] صوفیہ اپنے مقام کے لحاظ سے کتنے ہی واجب الاحترام کیوں نہ ہوں لیکن پھر بھی وہ غیر معصوم ہیں ان کی کسی بھی صریح غلطی کی تاویل نہیں ہو سکتی (اسدی)

معلوم ہوگیا ہے جس کی بدولت وہ :—

؎ درعینِ قدمِ حدوث و فنا را قائل اند و باوجودِ حدوث بقدمِ مائل

یعنی قدم و حدوث کا معاملہ اور وجود کی ان دو حیثیتوں کا باہمی رابطہ منطق سے نہیں بلکہ کشف و وجدان سے حل ہوتا ہے۔ دوامِ وجود بھی درست ہے اور قیامت و حشر بھی یقینی ہے —

؎ ہمہ اوست یا وحدتِ وجود کا مسئلہ تصوّف کا اُصولِ موضوعہ بن گیا ہے، لیکن اس کی تعبیر اس قدر نازک ہے کہ ذرا سا بھی انحراف ہو تو اس کے ڈانڈے الحاد سے مل جاتے ہیں۔ مغرب کا ایک مشہور مفکر شوپن ہار کہتا ہے کہ وحدتِ وجود کا نظریہ الحاد کی شاعری اور اس کی جدید تصنیف ہے۔ اور امریکہ کا فلسفی ولیم جیمز کہتا ہے کہ وحدتِ وجود اخلاقی تعطیل ہے یعنی ذاتِ واحد کے لازمی مظاہر ہونے کی وجہ سے خیر و شر کا باہمی امتیاز محض رہ جاتا ہے[1] اور باوجود اس تنبیہ کے کہ "گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی"، تمام مراتب ایک ہی وجودِ مطلق میں ضم ہوجاتے ہیں، مثلاً سحابی کی یہ رباعی لیجئے :—

؎ عالم بخروش لا الٰہ الّا ہوست ؛ غافل بگماں کہ دشمن است او یا دوست
دریا بوجودِ خویش موجے دارد ؛ خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست

تمام عالم میں ایک وحدتِ مطلقہ کا دریا موجزن ہے۔ اس میں کسی کی دشمنی یا دوستی کا سوال نہیں، کسی چیز کو خیر اور کسی کو شر سمجھنا اور ایک کا دوسرے سے برسرِ پیکار ہونا محض دھوکا ہے۔ نفس کی اندرونی پیکار یا نفس کی طبیعی عالم اور ماحول سے کشاکش غیر اصلی ہے۔

؎ گفتم از وحدت و کثرت سخنے گوی بہ رمز ؛ گفت موج و کف و گرداب ہمانا دریاست
؎ اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں ؛ حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

---

[1] — ملا اس نظریئے میں اسلام اور کفر کا باہمی امتیاز محض اعتباری بن جاتا ہے —
اکبر کا دینِ الٰہی اس نظریئے کی عملی تعبیر تھی — (اسری)

(غالبؔ)

ہے مشتمل نمودِ صُور پر وجودِ بحر ؏ یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

وحدتِ مطلقہ کا ایک لامتناہی رشتہ ہے جس میں گرہیں پڑ جانے سے کثرت کا دھوکا ہوتا ہے جس گرہ کو بھی کھول کے دیکھو اس میں رشتے کے سوا اور کچھ نہ ملے گا۔ عالم یا اشیائ کا خُدا سے الگ معلوم ہونا اسی قسم کا فریبِ ادراک ہے ــــــ

چونکہ وحدتِ وجود کا نظریہ اپنے نتائج میں قرآنی توحید سے جابجا ٹکراتا ہوُا معلوم ہوتا ہے، اس لئے مسلمان صوفیہ اور حکما کا ایک گروہ توحید وجودی کی بجائے توحیدِ شہودی کا قائل ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ عالم خُدا کے صفات کا مظہر ہے۔ مصدر کی وحدت کا پرتو مظہر پر بھی ہے۔ وجود موجودات کا بھی ہے اور خدا کا بھی، لیکن جن معنوں میں خُدا موجود ہے ان معنوں میں موجودات موجود نہیں۔ خدا اور مخلوقات کی باہمی نسبت کسی جسم اور اس کے سایہ کی نسبت ہے۔ سائے کا بھی وجود ہے لیکن جسم کے وجود کے مقابلے میں بے مایہ ہے اور اپنی ذات کے لئے جسم کا محتاج ہے۔ تمام ممکنات و حوادث ہستیٔ مطلق کے اظلال و پرتو ہیں۔ خدا کی ہستی کے مقابلے میں تمام اشیاء کی ہستی ہیچ اور کالعدم ہے۔ جب انسانی رُوح میں وحدت کا عرفان کاشفِ حقیقت ہوتا ہے تو پھر یہ کیفیّت ہوتی ہے کہ جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تُو ہے۔ اینما تولوا وجوھکم فثم وجہ اللہ

شیخ اکبرؒ اور بہت سے اکابر صوفیہ وحدتِ وجود کے قائل ہیں لیکن ان کے ہم مرتبہ دیگر صوفیہ جن میں مجدّد الف ثانیؒ بھی شامل ہیں وحدتِ شہود کو درست سمجھتے ہیں[1]۔

مولانا شبلیؒ مولانا رومؒ کے نظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں[2]۔

" وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود میں یہ فرق ہے کہ وحدتِ وجود کے لحاظ سے ہر چیز کو خدا کہہ سکتے ہیں، جس طرح حباب اور موج کو بھی پانی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن وحدتِ شہود

---

[1] نظریہ وحدۃ الشہود اور وحدۃ الوجود کے درمیان صرف لفظی اختلاف ہے۔ معنوی تعبیر کے لحاظ سے ان دونوں میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ کی کتاب مکتوبِ مدنی میں اس کی پوری تصریح موجود ہے۔ (اسدی)

[2] علاّمہ شبلی کی یہ تصریح غلو سے خالی نہیں ہے، ہندوستان کے اکثر اہلِ علم اس نظریئے سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ (اسدی)

ہیں یہ اطلاق جائز نہیں کیونکہ انسان کے سائے کو انسان نہیں کہہ سکتے۔ وحدتِ وجود کا مسئلہ بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے اور اہلِ ظاہر کے نزدیک تو اس کے قائل کا وہی صلہ ہے جو منصور کو دار پر ملا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وحدتِ وجود کے بغیر چارہ نہیں، کسی قدر منطقی بحث کے بعد مولانا شبلیؒ فرماتے ہیں کہ صحیح عقیدہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ عالَم قدیم ہے لیکن وہ ذاتِ باری سے علیحدہ نہیں بلکہ ذاتِ باری ہی کے مظاہر کا نام عالَم ہے ــــ

حضراتِ صوفیہ کا یہی مذہب ہے اور اس پر کوئی اعتراض لازم نہیں آتا۔ کیونکہ تمام مشکلات کی بُنیاد اس پر ہے کہ عالَم اور اس کا خالق دو جداگانہ چیزیں ہیں اور ایک دوسرے کی علّت و معلول ہیں ــــ آگے چل کر یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ فلسفہ کی رُو سے تو صوفیہ کے مذہب کے بغیر چارہ نہیں البتہ یہ شُبہ ہوتا ہے کہ شریعت اور نصوصِ قرآنی اس کے خلاف ہیں لیکن یہ شُبہ بھی صحیح نہیں قرآن مجید میں بہ کثرت اس قسم کی آیتیں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ظاہر و باطن اوّل و آخر جو کچھ ہے خدا ہی ہے ــــ [۱]

هو الاوّل هو الآخر هو الظاهر هو الباطن "

(حکمتِ رومی، از خواجہ عبدالحکیم پی ایچ ڈی)

---

۱ علامہ شبلیؒ کی یہ تحریر غلو سے خالی نہیں ہے۔ قرآن کی آیت سے بھی وحدۃ الوجود کے نظریہ کی تائید نہیں ہوتی۔ اختراعی تاویلوں سے تو ہر باطل پرست کوئی نہ کوئی دلیل قرآن سے نکال لیتا ہے۔ بہرحال وحدۃ الوجود یا وحدۃ الشہود یہ دونوں نظریئے صرف الحادی توحید کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس دَور میں سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ ان نظریات کی تردید کر کے اُمّتِ مسلمہ کے ایمان کو بچایا جائے (اسدی)

عالمِ اسباب

سلسلۂ علّت و معلول

خواجہ عبدالحکیم پی۔ایچ۔ڈی لکھتے ہیں :۔۔۔۔

حکما، سائنس، فلاسفہ، اہل دین اور صوفیہ سب کے ہاں سلسلۂ علّت و معلول کی توجیہات ملتی ہیں لیکن توجیہات میں بے حد اختلافات نظر آتے ہیں۔ کسی نظریۂ حیات میں یہ امر نہایت اساسی اور اہم ہوتا ہے کہ دُنیا میں جو سلسلۂ علّت و معلول نظر آتا ہے اس کی ماہیّت کیا ہے۔۔۔۔

انسان نے جب آزادانہ طور پر ماہیّت کائنات پر غور و خوض شروع کیا تو یہ اذعان اس میں موجود تھا کہ مظاہر کی کثرت اور اس کا تنوع ظاہری اور اعتباری ہے حقیقی نہیں، تمام مظاہر اور اعراض کی تہ میں کوئی ایک جوہر ہے اور اشیاء کی کثرت اسی ایک جوہر کی متغیر صُورتوں سے پیدا ہوتی ہے۔ مغربی فلسفہ کی تاریخ کو طالیس ملطی سے شروع کرتے ہیں کہ اس نے کہا کہ کائنات کا اصلی جوہر پانی ہے گویا پانی بحیثیّت جوہر علّت ہے اور تمام اشیاء و حوادث اس کے معلول ہیں۔ اس کے بعد دوسروں نے کہا کہ نہیں، ہوا اصلی جوہر ہے یا آگ اصلی جوہر ہے۔ اس کے ساتھ ہر ایک کو طبع آزمائی کرنی پڑتی تھی کہ اس کی

توجیہ کرے کہ ایک جوہر بسیط کو علّت مانا جائے تو یہ مختلف اور متضاد نما کثرت کہاں سے آئی۔ کچھ اس قسم کا سوال ان متفکّرین کے دلوں میں بھی اُبھرتا تھا جسے غالبؔ نے جو وحدۃالوجود کا قائل تھا ان اشعار میں بیان کیا ہے ــــــ

۵ جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود ؎ پھر یہ ہنگامہ اے خُدا کیا ہے

سبزہ و گُل کہاں سے آئے ہیں ؎ ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

مغربی فلسفہ ترقی کرتے ہوئے سقراط، افلاطون اور ارسطو کی تعلیمات تک پہنچا۔ ان سے قبل فیثا غورسیوں نے جو ریاضیات کے ماہر تھے اس عقیدے کی تعلیم دی تھی کہ تمام کائنات کی اصل ریاضیات کے اصول ہیں۔ ریاضیات کے اصول مادی علّتیں نہیں لیکن وہ مادّی صورتوں میں متشکل ہوتے ہیں۔ ہر شے کسی مخصوص ریاضیاتی تناسب سے ظہور میں آتی ہیں ــــــ افلاطون اور ارسطو نے اس سے آگے قدم بڑھایا کہ وجود کی حقیقت خدا ہے جو عقلِ خالص ہے، یہ عقل جو تصوّرات کا ایک منطقی نظام ہے زمانی اور مکانی یا جسمانی چیز نہیں ہے۔ یہ عقل حقیقی ہستی ہے اور اس کے علاوہ عدم ہی عدم ہے، لیکن اس عدم میں یہ انفعالی استعداد موجود ہے کہ وہ عقلی تصوّرات کو قبول کرکے وجود کی شکل اختیار کرلے، جب تک عدم عقلی تصوّرات یا اعیانِ ثابتہ سے متاثر نہیں ہوتا، تب تک وہ کوئی وجود اختیار نہیں کرسکتا ــــــ

ارسطو کہتا ہے کہ موجودات کا تدریجی نظام اسی اصول کی بدولت قائم ہے۔ ایک طرف مادۂ محض ہے جو عدمِ محض کے مترادف ہے اور دوسری طرف عقلِ خالص ہے جو خُدا ہے تمام موجودات اس اثباتِ کُلی اور عدمِ محض کے مابین واقع ہوئے ہیں۔ ارسطو نے کہا کہ علّتیں چار اقسام کی ہوتی ہیں، علّتِ فاعلی، علّتِ مادّی، علّتِ صوری اور علّتِ غائی۔ مثلاً ایک کوزہ گر کوزہ بناتا ہے، اس کے ہاتھوں کی حرکت اس کوزے کی علّتِ فاعلی ہے لیکن یہ فعلیّت بروئے کار نہ آسکتی اگر مٹّی موجود نہ ہوتی لہٰذا مٹّی بھی کوزے کی

علّت ہے اور یہ علّت مادّی ہے لیکن بنانے والا اس مٹی کو خاص صورت میں ڈھالنا چاہتا ہے یہ صورت اس کا سبب ہے کہ یہ مٹّی کوزہ بنی اور کوئی چیز نہ بنی۔ یہ علّتِ صوری ہے لیکن کوزہ گر کے ذہن میں کوزہ بنانے کی کوئی غرض تھی اس غایت نے بھی علّت کا کام دیا، یہی غرض کوزے کی علّتِ غائی ہے ـــــ

فلاسفہ کا عام عقیدہ جسے مسلمان حکما بھی صحیح سمجھ کر پیش کرتے تھے یہ تھا کہ عالم محسوسات و معقولات میں علّت و معلول کا ایک اٹل اور لامتناہی سلسلہ ہے جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ اٹل قوانین کے مطابق لزوم کے ساتھ واقع ہوتا ہے لیکن مذہب کی ادنیٰ سطح پر عقائدِ دینی کا مدار زیادہ تر معجزات پر ہوتا ہے، معجزہ کے عام معنی خرقِ عادت لئے جاتے ہیں یعنی عادتاً علّتیں جو معلولات پیدا کرتی ہیں وہ کسی خاص موقع پر کسی نبی کے تصرّف یا خدا کی مرضی سے متوقع نتیجہ پیدا نہیں کرتیں، مثلاً آگ کا کام جلانا ہے، لازم ہے کہ انسان کے جسم کو اگر آگ میں جھونک دیں تو وہ ایندھن کی طرح جل جائے گا۔ لیکن از روئے قرآن اہلِ اسلام کا عقیدہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو نمرود نے آگ میں ڈال دیا مگر آگ نے اُن پر کوئی اثر نہ کیا۔ وہ آگ اُن کے لئے ٹھنڈک اور سلامتی کا مقام بن گئی۔ عادتاً جو کچھ ہونا چاہیئے تھا۔ نتیجہ اس کے برعکس نکلا۔ کوئی مذہب ایسا نہیں جو اس قسم کے معجزات کا قائل نہ ہو۔ مذہب اور سائنس میں جو تخالف پایا جاتا ہے وہ زیادہ تر اسی بنا پر ہے انبیائ کے حالات میں ایسی باتیں بیان کی گئیں ہیں جنہیں خرقِ عادت یا معجزہ کہہ سکتے ہیں۔ بعض معقولات پسند لوگوں نے ان واقعات کی ایسی تاویلیں کرنے کی کوشش کی ہے جن سے یہ معجزات عام قوانینِ فطرت کے مطابق ثابت ہو سکیں ـــــ

لیکن ان تاویلوں میں خواہ مخواہ کی کھینچا تانی معلوم ہوتی ہے ـــــ

صحیح اسلامی عقیدہ یہی ہے کہ خُدا خالق و ناظمِ کائنات ہے محدود عقل کے حکمران جب کوئی قاعدہ بناتے ہیں تو کبھی تغیّرِ حالات اور کبھی محض متلون خواہشات سے قاعدے

بدل دیتے ہیں لیکن جو خالق علیم و حکیم اور عالمِ کُل ہے وہ ایسے قواعد نہیں بناتا جنہیں بار بار بدلنے کی ضرورت پڑے، موجودات و مظاہر کے عالم کے دو رُخ ہیں۔ ثباتِ آئین بھی ہے اور تغیرِ حوادث بھی۔ ہوائیں چلتی رہتی ہیں لیکن ہواؤں کے چلنے کا قانون اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ سیّارے گردش کرتے رہتے ہیں لیکن حرکت کے قوانین گردش نہیں کرتے ــــــ

حکماء طبیعیین کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے محدود تجربے کے مادّی عالم اور اس میں عمل کرنے والے قوانین کو کُلّی سمجھ لیا کہ جو کچھ ہے یہی ہے اور عادتاً علّت و معلول کا جو لزوم ہمارے تجربے میں آتا ہے اس کے علاوہ کائنات میں کوئی نہ کوئی اور قوّتیں کارفرما ہیں اور نہ کوئی اور اسباب ہیں، انہوں نے دُنیا کو عالمِ اسباب سمجھا۔ لیکن ان کا عالمِ تصوّر اور اسباب کا تصوّر نہایت محدود تھا، انہوں نے کُل کو اسی جُزو پر قیاس کیا جو ان کے محسوسات و معقولات کے محدود دائرے میں سما سکا۔ خُدا کی مشیّت کہیں بے حکمت نہیں اور حکمت کہیں متلوّن اور بے اصول نہیں۔ خُدا کا کوئی فعل عبث نہیں ہو سکتا جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ہر فعل کی کوئی نہ کوئی علّت ہوتی ہے۔ اسلام اس عقیدے کی تلقین کرتا ہے کہ حیات و کائنات کا سلسلہ اتنا وسیع ہے اور اس میں عمل کرنے والے اسباب و قوانین کی اتنی تعداد ہے کہ کلیتہً کسی کے احاطۂ ادراک میں نہیں آ سکتی ــــــ

اگر دُنیا کے تمام سمندر سیاہی اور روشنائی بن جائیں اور اس سیاہی سے کلماتُ اللہ، کو لکھنا شروع کر دیں تو یہ تمام سمندر اور ان جیسے اور بھی ختم ہو جائیں لیکن کلماتِ الٰہی ختم نہ ہوں ــــــ کچھ طبقات وجودِ انسانی کے سامنے اس کے اندر اور اس کے باہر موجود ہیں اور ہر طبقے میں علّت و معلول کا ایک الگ قسم کا سلسلہ ہے جمادات کو ان کی جمادی کیفیّت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ انہیں قوانین پر عمل کریں گے جو ان کیلئے فطرت کی طرف سے معیّن ہو چکے ہیں لیکن جمادات سے اُوپر نباتات کا درجہ ہے اور

نباتات کے قوانین جمادات سے الگ اور ان سے بالاتر ہیں جب نشوونما پذیر بیج زمین میں ڈالا جاتا ہے تو زمین کے جمادی عناصر پر نباتی قوانین کا عمل جاری ہوتا ہے۔ جماد کے عالمِ اسباب پر نبات کا سلسلۂ علّت و معلول دخل انداز ہو کر نتیجے کی صورت بدل دیتا ہے۔ گویا ہر پودے کی آفرینش ایک خرقِ عادت ہے، اسی طرح قرآنِ کریم معجزہ طلب کرنیوالوں کو بار بار کہتا ہے کہ دیکھو جمادی زمین میں سے نباتی زندگی کس طرح پیدا ہوتی ہے، انگریزی کا مشہور مصنّف بیورے نکلز اپنے سوانح میں لکھتا ہے کہ میں نے دین کی تلاش میں تمام ادیان اور فلسفوں کا مطالعہ کر ڈالا لیکن کسی بیان اور کسی استدلال نے مجھ کو خدا کی ہستی کا یقین نہ دلایا۔ آخر میں نے کتابوں سے رُوگردانی کر کے باغبانی شروع کی۔ جب زمین سے زنگارنگ کے پھول نکلے تو میں خدا کا قائل ہو گیا۔ حیات آفرینی اور جمال آفرینی کا یہ حیرت انگیز معجزہ تمام دلائل سے زیادہ قوی ثابت ہوا۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی باغبان منکرِ خدا نہیں ہوسکتا ——

نباتات میں جو قوانین عمل کرتے ہیں ان سے کچھ الگ قوانین اور الگ علّتیں حیوانات کی زندگی میں پائی جاتی ہیں۔ حیوانات نباتات کو کھا جاتے ہیں ہضم ہونے اور جزوِ بدن بننے کے بعد نباتات کی ماہیّت بدل جاتی ہے اور حیوانیت کی قوّت نباتات میں سے وہ معلولات پیدا کرتی ہے جو نبات میں بحیثیّتِ نبات پیدا نہ ہو سکتے۔ یہاں بھی خرقِ عادت ہی کا معجزہ ہے۔ ایک طبقۂ حیات کی عادت کو بالاتر طبقۂ حیات کی علّتوں نے کارفرما ہو کر بدل دیا محض حیوانیّت سے اوپر ذہن و نفس کا عالم ہے۔ نفسی قوانین مادّی اور جسمانی قوانین سے الگ ہوتے ہیں۔ مادّہ اور جسم کا عمل نفس پر ہوتا ہے لیکن اس کے برعکس نفس بھی مادّہ و جسم پر مؤثر ہوتا ہے۔ جسم کو اس کی فطری حالت پر چھوڑ دیں تو وہ اپنے قوانینِ معیّنہ کے مطابق عمل کریگا۔ لیکن نفس کی حالت کے تغیّرات، اس کی خواہشات، اس کے جذبات، اس کے ارادے جسمانی حالتوں میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں۔ خوشی اور

غم اور خوف اور حزن سب نفسی کیفیتیں ہیں لیکن یہ کیفیتیں جسم میں فوری تغیر پیدا کرتی ہیں ۔
اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی غیر متبدل سنت یہ ہے کہ ہستی کا ہر طبقہ ان مخصوص قوانین پر عمل کرے جو اس کے لئے مقرر ہیں لیکن اعلیٰ تر طبقے کا عمل ایک بالاتر قانون کے ماتحت ادنےٰ طبقے کے معلولات میں تبدیلی پیدا کرے تاکہ ادنیٰ اعلیٰ کے زیر اثر ہو کر خود اوپر کی طرف اٹھے اور اپنی ہیئت اور ماہیت میں ارتقائی انقلاب پیدا کرے ——

اشاعرہ نے جب یہ دیکھا کہ حکمائے طبیعین کے زیر اثر لوگ مادی علل کو ایک مستقل اور ناقابل تغیر سلسلہ سمجھ کر دینی عقائد سے منحرف ہو رہے ہیں تو انہوں نے سرے سے سلسلۂ اسباب ہی کا انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ اشیاء میں فی نفسہ کوئی خواص نہیں، کسی علت میں کوئی تاثیر نہیں کوئی سبب مؤثر نہیں۔ ہر قسم کے خوارق عادت اور کرامتیں ہر وقت ہر حالت میں سرزد ہو سکتی ہیں۔ حکماء اور اشاعرہ دونوں افراط و تفریط کے مرتکب ہوئے اور جادۂ حقیقت سے ہٹ گئے، حکماء کی تنگ نظری سے خود حکمت کو نقصان پہنچا اور مدعیان دین نے دین کی حمایت اس متعصبانہ اور جاہلانہ انداز سے کی کہ خود دین معقول انسانوں کی نظر میں قابل قبول نہ رہا، سچے دین کا یہ تقاضا نہیں ہو سکتا، کہ خدا کے مقرر کردہ سلسلۂ اسباب کا انکار کیا جائے ۔ دین کا تقاضہ فقط یہ ہے کہ خدا کو مسبب الاسباب مانا جائے اور یہ یقین کیا جائے کہ کائنات میں اسباب کے جو سلسلے ہیں وہ خود بخود وجود میں نہیں آئے یہ نظم کسی ناظم نے پیدا کیا ہے اور وہ ناظم اس نظم کو پیدا کرنے کے بعد خود معطل نہیں ہو گیا، اسباب و وسائط میں جو اثر ہے۔ اور چیزوں کے اندر جو خیر و شر ہے وہ خدا کی حکمت و مشیت کا آفریدہ ہے ——

طبیعی سائنس کی ترقی اس یقین کی بدولت ہوئی کہ مادی عالم میں علت و معلول کا ایک سلسلہ ہے یعنی یکساں علتیں، یکساں معلولات پیدا کرتی ہیں۔ معلولات سے علل کی طرف اور علل سے معلولات کی طرف استدلال ہو سکتا ہے۔ یعنی مادی عالم میں جو سنت اللہ

تھی وہ سائنس دانوں پر منکشف ہوتی گئی اور اس علم سے جو مظاہر کے روابط کا علم تھا انسان کو قوّتِ تسخیر حاصل ہو گئی۔ عناصر کے خواص کا جوں جوں علم بڑھتا گیا انسان ان کی ترکیب و تحلیل سے جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کے سامان مہیا کرتا گیا۔ اس کامیابی نے مادّی زندگی میں انسان کی بے بسی کو بہت کچھ کم کر دیا۔ یہاں تک تو بات درست بھی تھی اور مفید بھی، لیکن مادّی فطرت کی اس تسخیر نے طبیعی علماء کے ذہنوں میں یہ مغالطہ پیدا کر دیا کہ تمام موجودات کا جوہرِ اصلی ہی مادّہ ہے۔ مادّی مظاہر کی تسخیر ریاضیات کے اطلاق سے ہوئی تھی اس لئے یہ عقیدہ استوار ہو گیا کہ حوادث کی تمام کیفیتیں کمیّتوں میں تحویل ہو سکتی ہیں جو چیز حقیقی ہے وہ ناپی اور تولی جا سکتی ہے۔ جو چیز ناپی یا تولی نہ جا سکے وہ نہ کوئی حقیقی علت ہے اور نہ کوئی حقیقی معلول۔ جسم اور دماغ مادّی ہیں لہذا وہ حقیقی ہیں لیکن نفس کا وجود محض خیالی ہے ـــــ

انسان یہ بھول گیا کہ خود مادّے کا علم بھی آخر نفس کی وساطت سے حاصل ہوا اگر نفس محض سیمیائی ہے تو مادّے کے متعلّق اس کے محسوسات اور معقولات بھی بے حقیقت ہونے چاہئیں۔ یہ عجیب بات تھی کہ نفس کی علمی پیداوار کو حقیقی سمجھ لیا لیکن خود نفس کے وجود سے انکار کر دیا۔ نفس کا اگر کوئی وجود ہی نہیں تو وہ کوئی مؤثر عامل کیسے ہو سکتا ہے۔ لہذا نتیجہ یہ نکالا کہ علّتیں تمام مادّی ہیں۔ جمادات کے قوانین زیادہ وضاحت سے سمجھ میں آ گئے تھے اس لئے کہ یہ قوانین مقابلتاً سادہ ہوتے ہیں اور اُن کا لزوم ریاضیات کا سا لزوم ہوتا ہے جس طرح ہندسوں اور ہندسی اشکال کے خواص معین اور غیر متبدّل ہوتے ہیں۔ اسی طرح برق و باد کے اعمال بھی اٹل قوانین کے زیرِ نگیں ہوتے ہیں ـــــ

جمادات کے اُوپر نباتات کا درجہ تھا جہاں علّتیں خالص مادّی نہیں رہتیں وہاں زندگی کی ابتداء تنظیم جمال آفرینی اور مقصد کوشی شروع کر دیتی ہے۔ سنگ و خشت میں کہیں یہ کیفیت نظر نہیں آتی۔ اب طبیعیین نے اس سعیٔ لاحاصل میں مغز کھپانا شروع کیا

کہ نشوونما کے اعمال کی توجیہ مادّے کے میکانکی اعمال سے کی جائے، نباتات کی ابتدائی سی زندگی کو بھی وہ مقصد کوش علّت و معلول کے سلسلے سے خارج کرنا چاہتے تھے اور اس کا اقرار کرنا علم طبیعیات کی توہین سمجھتے تھے کہ خالی مادّہ اور مادی حرکت کے علاوہ حیات کی مقصود طلبی بھی کائنات میں موجود ہے۔ یہاں اسباب کا سلسلہ اور انداز کا ہو جاتا ہے اور حیات اپنی ادنیٰ منزل میں بھی مادہ محض پر اثر کر کے اس کے نتائج کو بدلتی اور اپنے مقاصد کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیّت رکھتی ہے۔ غلطی اس میں نہ تھی کہ انسان سلسلۂ اسباب کا قائل ہو جائے اور اس عقیدے پر عمل کر کے تسخیرِ فطرت کرے بلکہ اصل کوتاہی اس میں تھی کہ انسان نے زندگی کے ادنےٰ ترین مظہر یعنی عالمِ مادّی کو حقیقتِ کُلی تصوّر کر کے جس قسم کا سلسلۂ علّت و معلول اس میں نظر آیا اس کو تمام موجودات پر حاوی سمجھ لیا انسان کی اصل حقیقت نفسی ہے۔ انسان کا نفس جسم کو لطور آلہ استعمال کرتا ہے اور عالمِ مادّی سے بھی اپنے مخصوص مقاصد کا حصول چاہتا ہے ——

مادیّت، حقیقتِ حیات اور حقیقتِ نفس کی منکر ہو گئی اور خیر و شر کی نسبت فقط یہ نظریہ رہ گیا کہ جسمانی زندگی کو فائدہ پہنچانے والی یا جسمانی لذّت پیدا کرنے والی چیز انسان کو خیر محسوس ہوتی ہے اور جس چیز سے جسمانی دُکھ پہنچے اس کو انسان شر سمجھتا ہے۔ تمام اخلاقیات محض جسمانی لذتیت بن گئی ——

انگلستان میں لذتیّت کے امام بنتھم نے کہا کہ لذّتوں میں مقدار یا کمیّت کا فرق ہوتا ہے کیفیّت کا کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ذوقِ علم، ذوقِ جمال، عدل و رحم کی لذّت، کارِ خیر کی لذّت اور حلوا کھانے کی لذّت سب مساوی ہیں۔ اِس مادی فلسفے کے مطابق کائنات میں کوئی اخلاقی نظام نہیں ——

ہکسلے نے کہا کہ کائنات میں کہیں اخلاق کا وجود نظر نہیں آتا۔ کائنات کے خالص مادّی شعبے کورانہ میکانکی جبر کی وجہ سے اخلاق سے بے نیاز ہیں اور نباتات و حیوانات کے

تنازع البقا میں حد درجے کا ظلم نظر آتا ہے۔ اخلاقی اقدار اتفاقی طور پر انسان کے اندر سے اُبھر پڑے ہیں۔ چیز اچھی ہے اس کو باقی رکھنے اور ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہیئے لیکن اعتقاد یہی رکھنا چاہیئے کہ کائنات اور اس میں کارفرما قوتیں نہ اس کی ماخذ ہیں اور نہ اس کی حامی۔ مادیّین کی منطق میں صریحی داخلی تناقص پیدا ہو جاتا ہے۔ خصوصاً جب اس کا اطلاق زندگی پر کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر علّتیں فقط مادّی ہوں اور نفس بھی مادّی ہو تو بھلائی کو ترجیح دینے اور بُرائی سے بچنے کا اختیار کہاں سے آئے گا۔ مادّی فلسفہ کے لحاظ سے اختیار بے معنی چیز ہے اور نفس کا ایک دھوکہ ہے ——

(حکمتِ رومیؒ)